برزخ
امجد
اسلام
امجد

○

امجد اسلام امجد کے بارے میں لکھتے ہوئے میں ایک عجیب اُلجھن میں گرفتار ہوں کہ شاعری کے بارے میں لکھی جانے والی تنقیدی تحریریں اتنی بوسیدہ اور اتنی عام ہو چکی ہیں کہ اِس رسمِ عام میں کسی شاعر کے ہاں کوئی نئی سمت تلاش کرنے اور اس کی وضاحت کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں شاعری کے بہت دیوان چھپتے ہیں۔ یہاں ہر شاعر جدید ہے۔ ہر شاعر کا سیاسی اور سماجی شعور بہت تیز ہے اور یہاں ہر شاعر صلیب اُٹھائے کھڑا نظر آتا ہے۔ چند اصطلاحوں کی ایک قید گاہ ہے جس میں ہمعصر شعری کائنات نظر بند کر دی گئی ہے اور شعرا کی اکثریت اس قید کو فخر کا نشان سمجھ کر قبول کئے ہوئے ہے اور اپنی اس نظر بندی پر مطمئن اور نازاں۔

نوجوان شعرا میں امجد اسلام امجد ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں شاید موجودہ عہد کی منظور شدہ تمام صفات موجود ہوں مگر ایک صفت اس کے کلام میں ایسی ہے جو اس کے عام ہمعصروں کی شاعری میں نہیں ہے کہ اس کی نظم میں اثر اور تاثیر ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہی شاعری اور امجد اسلام امجد کے کلام میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اس کا کلام ایک شاعر کا کلام لگتا ہے اور اس زمانے میں اس کا پیرایۂ اظہار ایک رفیق شاعر کا اظہار محسوس ہوتا ہے ــــ امجد کی جدیدیت محض عمر کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک نئے طرزِ احساس کی وجہ سے ہے جس احساس میں میں بھی شریک ہوں۔

مُنیر نیازی

برزخ

نظمیں

مکتبۂ فنون، لاہور

بار اوّل

تاریخِ اشاعت — اکتوبر ۱۹۷۴ء

تعداد — ایک ہزار

ناشر — مکتبۂ فنون، ۴۷ انارکلی لاہور

طابع — اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور

کتابت — محمد حسین (شاہ)

سرورق — اسلم کمال

قیمت — بارہ روپے

فردوس کے نام

ترتیب

کچھ باتیں نثر میں

"برزخ" گزشتہ سات برس پر محیط ہے۔ میں نے یہ "عہدِ جوانی" کس طرح کاٹا ہے اس کی داستان تو آپ نظموں میں پڑھ لیں گے، یہاں میں جو بات اپنے پڑھنے والوں سے کرنا چاہتا ہوں وہ شاعری کے بارے میں میرے نظریے سے متعلق ہے چونکہ مجھے نام نہاد روایت پرستوں اور سوڈو انقلابیوں سے بیک وقت چڑ ہے لہٰذا ان کی تنقید و تحسین کی پروا کیے بغیر، میں اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ شاعری میرے نزدیک روایت میں موجود امکانات کی بازیافت کا عمل ہے لیکن یہ عمل ہوا میں انجام نہیں پاتا۔ اس کے لیے شاعر کا اپنے معاشرے سے تشخص ایک لازمی شرط ہے۔ اپنے عوام، قوم، وطن اور پھر تمام دنیا سے ــ بحیثیت ایک سوچنے والے انسان کے ــ اس کا تخلیقی رشتہ ہوتا ہے اور ان حوالوں کے بغیر اُس کی شاعری کا بدلتی ہوئی دنیا سے ہم آہنگ ہونا ممکن نہیں اور اس سلسلے میں آخری لیکن سب سے اہم شرط اُس کے رویّے کی ہے۔ میں ذاتی طور پر فن اور زندگی دونوں کے متعلق معتدل لیکن حق پرستانہ رویے کا حامی ہوں۔

یہ نظمیں میرے ذاتی، جذباتی، روحانی اور سیاسی مسائل اور احساسات کے عکس ہیں۔ میں داخلیت کے خلاف نہیں لیکن معاشرے سے کٹ کر اپنے خول میں محدود ہو جانے کو تخلیقی فنکار کی ناکامی سمجھتا ہوں۔ معاشرے کے ترقی پسندانہ سچے اور ظلم کے خلاف برسرِ پیکار رویوں سے کومٹ کیے بغیر کوئی فنکار صحیح معنوں میں "تخلیقی فنکار" کہلانے کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ یہاں میں یہ بات واضح کر دوں کہ کومٹ منٹ کا اظہار رویے اور عمل سے ہوتا ہے، نعرے بازی سے

نہیں۔ اس کتاب کی بہت سی نظموں میں پاکستان کی سات برس کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کا عکس ملے گا۔ ہو سکتا ہے بعض اصحاب کو میری سوچ اور تجزیے سے اختلاف ہو مگر یہ جو کچھ بھی ہے، میرے محدود علم اور سچے جذبات کا مجموعہ ہے اور یوں بھی اختلاف رائے خاصی اچھی چیز ہے بشرطیکہ مقصد خیر کا حصول ہو۔

میں ماضی کو حال اور مستقبل کی اکائی میں دیکھتا ہوں۔ اس لیے ان نظموں میں فن اور اسلوب کے حوالے سے اُردو شاعری کی روایت کا اثر نظر آئے گا، لیکن یہ اثر ماضی کے زندہ اور جاندار حصّے سے متعلّق ہے۔ میں مردہ پرست نہیں۔ صرف گئے ہوؤں کی اچھائیوں کو مردہ سمجھنے سے انکاری ہوں۔ یہ کتاب حمد، نعت اور سلام سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد کی نظمیں اُسی ترتیب سے درج ہیں، جس سے یہ ذہن سے کاغذ تک آئی ہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہیں میں آپ کے سامنے بغیر کسی معذرت کے، اور اس اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ اُردو شاعری کے بحرِ ذخار میں ایک موج کا ہی سہی، اضافہ ضرور کریں گی۔

میں اپنے بزرگوں اور دوستوں خصوصاً جناب احمد ندیم قاسمی، جناب صلاح الدین محمد، جناب اختر حسین جعفری اور جناب یحییٰ امجد کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان نظموں کے انتخاب میں میری مدد کی، اور اپنے دوست مظفر بخاری کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ اُنہی کی محبّت کی بدولت یہ نظمیں کتابی شکل میں آپ تک پہنچ رہی ہیں۔

امجد اسلام امجد

۲۵/۹/۷۴

حمد

خدائے برتر تری زمیں پر
جو کچھ ہے تُو ہے، تری مشیّت
وہ لفظِ اوّل ہے جس کا آخر تو آپ ہی ہے
تو ایسا رازق ہے
جس کے دستِ عطا سے پتّھر میں بند کیڑے کی زندگی ہے۔
تجھے یقیناً یہ علم ہوگا تری زمیں پر
کچھ ایسی بدبخت بستیاں بھی ہیں جن کے باسی
تری توجہ کے خواب قریے میں جی رہے ہیں،
تری توجّہ کا خواب قریہ، جہاں اندھیرا ہی روشنی ہے۔
جہاں کروڑوں سیاہ، پیلے، نحیف بچّے
شکم کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں

اور اپنی سہمی اُداس ماؤں
کے خشک سینوں سے بھُوک پیتے ہیں
جن کے مردوں کی ساری دولت فقط پسینہ ہے
جس کے بدلے وہ زندہ رہنا خریدتے ہیں

مجھے بتا ان گرسنہ نسلوں کا جرم کیا ہے!
یہ کس سے اپنے گناہ پوچھیں!
جو اپنے رستے سے بے خبر ہیں
وہ کس طرح تیری راہ پوچھیں!

نعت

ابر، خورشید، قمر
روشنی، پھول، صدا
سب تھے موجود مگر
ان کا مفہوم نہ تھا
کوئی بھی چیز کوئی چیز نہ تھی
سرِ مخفی تھا خدا
کوئی تخلیق نہ تھی
حرفِ اقرار نہ تھا
مُہرِ توثیق نہ تھی
سنگ اور گوہرِ نایاب میں تفریق نہ تھی
آپ نے سرد عناصر کو حرارت بخشی
آپ نے صلِّ علیٰ

ابر، خورشید، قمر
روشنی، پھول، صدا
سب کو مفہوم دیا
حاجتِ کون و مکاں، مقصدِ نوعِ بشر
مجھ پہ بھی ایک نظر
مجھ کو بھی دستِ بجے کبھی
میرے ہونے کا پتا
یا نبی صَلِّ علیٰ - یا نبی صَلِّ علیٰ -

سلام

میں نوحہ گر ہوں
میں اپنے چاروں طرف بکھرتے ہُوئے زمانوں کا نوحہ گر ہوں
میں آنے والی رُتوں کے دامن میں عورتوں کی اُداس بانہوں کو دیکھتا ہوں
اور اُن کے بچّوں کی تیز چیخوں کو سُن رہا ہوں
اور اُن کے مَردوں کی سر دلاشوں کو گن رہا ہوں
میں اپنے ہاتھوں کے فاصلے پر فصیلِ دہشت کو چھُو رہا ہوں

زمیں کے گولے پہ زرد، کالے تمام نقطے لہو کی سُرخی میں جل رہے ہیں
نئی زمینوں کے خواب لے کر
مسافرانِ تباہ یادوں کے ریگزاروں میں چل رہے ہیں
میں نوحہ گر ہُوں مسافروں کا جو اپنے رستے سے بے خبر ہیں،
میں ہوش والوں کی بدحواسی کا نوحہ گر ہوں

حسینؑ، میں اپنے ساتھیوں کی سیہ لباسی کا نوحہ گر ہوں،
ہمارے آگے بھی کربلا ہے، ہمارے پیچھے بھی کربلا ہے
حسینؑ، میں اپنے کارواں کی جہت شناسی کا نوحہ گر ہوں۔

نئے یزیدوں کو فاش کرنا ہے کام میرا
ترے سفر کی جراحتوں سے
ملا ہے مجھ کو مقام میرا
حسینؑ، تجھ کو سلام میرا

سرمایۂ جاں

یہ سب نے دیکھا
کہ سازِ گُل سے نکل کے خوشبو کا ایک جھونکا
ہزار نغمے سنا گیا ہے
مگر کسی کو نظر نہ آیا کہ اِس کے پردے میں گُل نے اپنا
تمام جوہر لُٹا دیا ہے

یہ میری سوچوں کی سبز خوشبو
یہ میری نظمیں یہ میرا جوہر
یہ میرے لفظوں کے شاہزادے
یہ میری آواز کے مسافر
نکل کے ہونٹوں کی وادیوں سے
خموشیوں کے مہیب جنگل میں آہٹوں کے فریب کھاتے
نشاطِ منزل کی جستجو میں
اُداس رستوں پہ چل رہے ہیں
سفر کے دوزخ میں جل رہے ہیں

۲۶/۲/۶۷

بازگشت

ایسی ہی سرد شام تھی وہ بھی،
جب وہ مہندی رچائے ہاتھوں میں
سُرخ آنچل میں منہ چھپاتے ہُوئے
اپنے خط مجھ سے لینے آئی تھی۔

اُس کی سہمی ہُوئی نگاہوں میں کتنی خاموش التجائیں تھیں!
اُس کے چہرے کی زرد رنگت میں کتنی مجبوریوں کے سائے تھے!
میرے ہاتھوں سے خط پکڑتے ہی
جانے کیا سوچ کر اچانک وہ
میرا شانہ پکڑ کے روئی تھی

اُس کے یاقوت رنگ ہونٹوں کے کپکپاتے ہُوئے کناروں پر
ثبت بیتے ہُوئے زمانے تھے،
سینکڑوں ان کہے فسانے تھے،

سردشاموں میں آج بھی اکثر
اُس کی رُخصت کا بے صدا منظر، میری آنکھوں میں جِھلملاتا ہے
ایک لمحہ حنائی ہاتھوں سے مجھ کو اپنی طرف بُلاتا ہے،

ایسی ہی سرد شام تھی وہ بھی

۱۹
۵
۶۷

فاصلے

اب وہ آنکھوں کے شگوفے ہیں نہ چہروں کے گلاب
ایک منحوس اُداسی ہے کہ مٹتی ہی نہیں
اتنی بے رنگ ہیں اب رنگ کی خوگر آنکھیں
جیسے اُس شہرِ تمنّا سے کوئی ربط نہ تھا
جیسے دیکھا تھا سراب۔

دیکھ لیتا ہوں اگر کوئی شناسا چہرہ
ایک لمحے کو اُسے دیکھ کے رُک جاتا ہوں
سوچتا ہوں کہ بڑھوں اور کوئی بات کروں
اُس سے تجدیدِ ملاقات کروں
لیکن اُس شخص کی مانوس گریزاں نظریں
مجھ کو احساس دلاتی ہیں کہ اب اُس کے لیے
میں بھی انجان ہوں، اک عام تماشائی ہوں
راہ چلتے ہُوئے ان دوسرے لوگوں کی طرح۔

۳/۸/۶۷

منزلِ منزل

(T.S - ELIOT کے نام)

ہمارے جسموں کے سرد خانے ازل کے شعلے میں جل رہے ہیں
ہم اپنے پاؤں
ہوا کی بے رنگ سیڑھیوں پر
کچھ اس طرح سے سنبھل سنبھل کر جما رہے ہیں
کہ جیسے پھسلے
تو اس بلندی سے ایسی پستی میں جا گریں گے
جہاں اندھیرے، سیاہ غاروں سے کوئی رستہ نہ مل سکے گا
جہاں تمنّا کے خشک ہونٹوں پہ کوئی غنچہ نہ کِھل سکے گا۔
ہوا کے زینوں کو ہم نے اپنا رفیقِ منزل بنا لیا ہے
فنا کے رستے کو پا لیا ہے
ہم آرزوؤں کی تیز حدّت میں ہولے ہولے پگھل رہے ہیں

ہمارے چاروں طرف سمندر رہے اور پانی کے تُند ریلے
ہمارے جسموں کے آبگینے اُٹھا اُٹھا کے پٹک رہے ہیں
ہماری کشتیٔ ازل کے دریا کی ریتلی تہہ میں کھو چکی ہے
ہمارے چاروں طرف ہماری ہی خواہشوں کے بھنور پڑے ہیں
ہماری ٹانگیں عجیب رنگوں کے پتّھروں سے اُلجھ اُلجھ کر
سیاہ مٹی میں دھنس رہی ہیں
کئی جزیرے ہماری آنکھوں کے راکھ دانوں میں جل رہے ہیں۔

کسی نے ہنس کر بُلا لیا تو ہر ایک دھڑکن چہک اُٹھے گی
کسی نے دامن چھڑا لیا تو اک آگ دل میں بھڑک اُٹھے گی
ہماری خوشیوں کی عمر کیا ہے!
ہمارے دکھ کی بساط کیا ہے!
ہم اپنے ہاتھوں میں شمع لے کر ہوا کے رستے پہ چل رہے ہیں

ہماری آنکھوں کے سب ستارے گناہ راتوں کی تیرگی میں
جوان سینوں، گداز جسموں کے پیچ و خم میں بکھر گئے ہیں

ہمارے سانسوں میں بسنے والی تمام خوشبوئیں مر چکی ہیں
ہم اپنے ہاتھوں کو روز اپنے ہی خشک بالوں میں پھیرتے ہیں۔
ہمارے چہروں کی سرخ رنگت میں زردیوں کے مہیب سائے
بڑے تسلسل سے بڑھ رہے ہیں،
ہماری پینٹوں کی پیٹیوں کے پرانے سائز بدل رہے ہیں۔

ہم اپنے ماضی کے پھول دانوں سے آرزوؤں کے برگ ریزے
کچھ اس توجہ سے چن رہے ہیں کہ جیسے اِن کو
رلا کے رکھنے سے کوئی غنچہ چٹک اٹھے گا
ہم اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں، رفاقتوں کی
گلاب تصویریں البموں میں کچھ اس طرح سے سجا رہے ہیں
کہ جیسے ان میں سے کوئی پیکر
اچانک اک دن دھڑک اٹھے گا۔
ہمارے خوابوں کی وادیوں میں عجیب چشمے ابل رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف ہزاروں تلاش راہیں پڑی ہوئی ہیں
کہیں دریچے کھلے ہوئے ہیں کہیں صلیبیں گڑی ہوئی ہیں

مگر ہماری نظر کے آگے دبیز پردے لٹک رہے ہیں
ہم اپنے رستے سے بے خبر ہیں اکیلے پن میں بھٹک رہے ہیں
ہم آنے والے ہر ایک لمحے کی رہگزر میں کھڑے ہیں لیکن
ہماری ٹانگوں میں ایک لمحے کے ساتھ چلنے کا دم نہیں ہے
نئے جزیروں کی آرزو ہے کنارِ دریا مچل رہے ہیں۔

کھُلے دریچوں میں چلمنوں میں
ہجوم سڑکوں میں ہوٹلوں میں
ہزار چہرے ہماری آنکھوں کی خلوتوں کو سنوارتے ہیں
کسی کے عارض، کسی کے گیسو
ہمارے خوابوں کی وادیوں کو بہار بن کر نکھارتے ہیں
مگر ہمارے قریب آکر
ہر ایک چہرے کی خوش نمائی بدن کے لفظوں میں بولتی ہے
ہمارے خوابوں کو رولتی ہے
ہم اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے فنا کے رستے پہ چل رہے ہیں
ہمارے جسموں کے سرد خانے ازل کے شعلے میں جل رہے ہیں

۲۸
۹
۶۷

ہمزاد

کچھ کیا جائے نہ سوچا جائے
مُڑ کے دیکھوں تو نہ دیکھا جائے
میری تنہائی کی وحشت سے ہراساں ہو کر
میرا سایہ میرے قدموں میں سمٹ آیا ہے
کون ہے پھر جو مرے ساتھ چلا آتا ہے
میرا سایہ تو نہیں!!
کس کی آہٹ کا گماں،
یوں مرے پاؤں کی زنجیر بنا جاتا ہے
دُور تا حدِّ نظر شہر کے آثار نہیں
اور دشمن کی طرح
شام تلوار لیے سر پہ چلی آتی ہے،

بولتا ہوں تو اچانک کوئی
میری آواز میں آواز ملا دیتا ہے
مجھ کو خود میرے ہی لفظوں سے ڈرا دیتا ہے

کون ہے جس نے مرے قلب کی دھڑکن دھڑکن
اپنے احساس کی سُولی پہ چڑھا رکھی ہے !
میری رفتار کے پُرخوف و خطر رستے میں
کس نے آواز کی دیوار بنا رکھی ہے !
سنگِ آوازہ کی دیوار گراؤں کیسے !
کچھ کیا جائے نہ سوچا جائے
مُڑکے دیکھوں تو نہ دیکھا جائے۔

۳
۱۲
۶۷

ناشناس

وہ چنچل البیلی لڑکی میری نظمیں یوں پڑھتی ہے
جیسے ان نظموں کا محور
اُس کی اپنی ذات نہیں ہے،
(یعنی اتنی سندر لڑکی اور کوئی بھی ہو سکتی ہے !)
جیسے اُس کو علم نہیں یہ ساری باتیں اُس کی ہیں
ساری گھاتیں اُس کی ہیں،
ہر آہٹ ہے اُس کی آہٹ، سب سائے ہیں اُس کے سائے
سارے محمل اُس کے ہیں،
ہر خوشبو ہے اُس کی خوشبو، سب چہرے ہیں اُس کے چہرے،
سارے آنچل اُس کے ہیں
جیسے اُس کو علم نہیں ہے اُس لڑکی کے سارے کام
سارے نام اُسی کے ہیں
ہر کھڑکی ہے اُس کی کھڑکی سارے بام اُسی کے ہیں۔

اُس لڑکی کے نام سے میں نے جو کچھ اپنے نام لکھا ہے
اُس سے ہی منسوب ہُوا ہے
(شاید میرا وہم ہو لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے)
جب میں نظم سُناتا ہوں وہ آنکھ چُرانے لگتی ہے
مجھ سے نظریں مل جائیں تو وہ شرمانے لگتی ہے
کچھ لمحے وہ چنچل لڑکی گُم سُم سی ہو جاتی ہے
لیکن تھوڑی دیر میں پھر سے پتّھر کی ہو جاتی ہے
جیسے میری نظم کی لڑکی۔

۵/۱۲/۶۷

خود سپردگی

رات بھیگے تو پُرانے قصّے
پئے ترتیب کوئی اور سہارا ڈھونڈیں،
چاندنی — نیند کا پھیلا ہُوا جادو لے کر
دل کے بے خواب نگر میں اُترے
اور ہوا — دھوپ سے بولائی ہُوئی سڑکوں پر
لوریاں گاتی نکلے
اوس — ہر پھُول کے دامن میں ستارے بھر دے

لیکن اس خواب خیالی کا نتیجہ کیا ہے!
رات کی گود مرے درد کی منزل تو نہیں،
دامنِ گُل پہ چمکتی شبنم
لوریاں دیتی ہُوئی سرد ہوا

چاندی کی نرم سنہری کرنیں
سب کے سینوں میں اُتر جائیں گی
کل کے سُورج کی جھلستی کرنیں
درد پھر خاک بہ سر آئے گا
خواب کی آنکھ میں سمٹا ہُوا سارا کاجل
خود اسی خواب کے چہرے پہ ۔ بکھر جائے گا ۔

دل کے قصّوں کا مقدّر ہے پریشاں حالی
پئے ترتیب سہاروں کا تعاقب چھوڑو ،
سوچ کے بخت میں اظہار کا لمحہ کب تھا ؟
دلِ ناکام سرابوں کا تعاقب چھوڑو
صبح دم پھر وہی تتلی کا تماشا ہو گا
جاگتی رات کے خوابوں کا تعاقب چھوڑو !

۲۲
۲
۶۸

میں اُسے دیکھ کے حیران ہُوا پھرتا ہُوں

میں اُسے دیکھ کے حیران ہُوا پھرتا ہوں،
وہی گاتی ہُوئی آنکھیں وہی اندازِ کلام
وہی گلنار تبسّم سے دہکتا چہرہ
وہی خوش رنگ خرام،
نرم لہجے میں ترنّم کی وہی گُل کاری
جیسے وہ کل کی گئی آج چلی آئی ہو۔
جیسے سب جاگ کے کاٹی ہُوئی کالی راتیں
سرد کمرے میں ٹھٹھرتی ہُوئی سوچیں، یادیں
رات بھر روئی ہُوئی آنکھ سے بھیگے تکیے
اور تالو سے چمٹے ہُوئے کڑوے لمحے،
(میرے بہکے ہُوئے خوابوں کے تراشیدہ تھے!)

میں نے سوچا تھا گزرتے ہوئے کڑوے لمحے
اُس کے تالو سے بھی چمٹے ہوں گے!
اُس کے تکیوں پہ بھی میری یادیں
اشک بن بن کے ٹپکتی ہوں گی!
سردراتوں میں ستمِ تنہائی
اُس کی نیندوں کو بھی کھاتا ہوگا!
اُس کی آنکھوں میں مگر درد کا سایہ بھی نہ تھا
(جیسے وہ گزرے ہوئے وقت سے گزری ہی نہ تھی)
جیسے اُس نے مجھے چاہا بھی نہ تھا

مجھ کو یوں سامنے پاکر وہ ہراساں نہ ہوئی
میرے بے ربط سوالوں سے پریشاں نہ ہوئی
اپنے مانوس تبسّم میں ترنّم بھر کر
مجھ سے چلتے ہوئے بولی "ہلّو
شاعرِ وقت کہو، کیسے ہو"
میں اُسے دیکھ کے حیران ہوا پھرتا ہوں۔

۱۶
۳
۶۸

وہ ابھی اپنے چہرے میں اُترا نہیں

کس سے پوچھوں وہ کیا
شخص ہے جو مری
آرزو کے جھروکوں میں ٹھہرے ہُوئے
سارے چہروں میں بکھرا ہُوا ہے مگر
خود ابھی اپنے چہرے میں اُترا نہیں ۔

کس سے پوچھوں وہ کیا
نام ہے جو مری
دھڑکنوں کے مقدّر میں مرقوم ہے
اور وہ کیا اجنبی ہے جو صدیوں سے میرے خیالوں کے قریے میں آباد ہے،
مگر میرا صورت شناسا نہیں ۔

کس کی آواز ہے !
جو مری روح میں نغمہ پرواز ہے !
کون بتلائے گا اُس نگر کا پتہ ،
جس کی مٹی کی خوشبو مرے جسم کے واسطے درج ہے ،
جس کے دیوار و در میری بے خواب آنکھوں سے مانوس ہیں
اور جس کو کبھی میں نے دیکھا نہیں ۔

نارسائی مری ۔ نارسائی مری !
جس کو پایا نہ تھا اُس کو کھونے کا غم
میری خواہش کے سینے کا ناسُور ہے ،
کس کو آواز دوں ، کس کا ماتم کروں !
وہ ابھی اپنے چہرے میں اُترا نہیں ،
کس سے پوچھوں مرا مدّعا کون ہے !
نارسا کون ہے !

۲۶
۳
۶۸

شہرِ بے مثال

ششدر ششدر قریہ قریہ
حیراں حیراں لوگ
سب گلیوں میں شور بپا ہے
سب گلیاں سنسان
سب آنکھیں انجان
سب شعروں اور سُروں کے پیچھے نوحوں کا احساس
پھُولوں کے قریے سے ملا ہے رنگوں کو بن باس
سارے بام اُداس
پتّوں کی زردی سے کھائے ٹھنڈی شبنم جوش
دیوانے پتّھر کو ترسیں، فرزانے مدہوش
مستانے خاموش

رشتوں کا اک جال بچھا ہے گونگے ہیں بازار
سب ہونٹوں پر قفل پڑے ہیں آنکھوں میں زنگار
بات کرو تو کوئی نہ چونکے سب چہرے دیوار
ہر سُو رسن و دار
دھواں دھواں آنکھوں کے آگے
سب منظر سب حرف
ہر اک خواہش برف
چاروں جانب بول رہی ہے تنہائی کی دف
دیواروں سے پھُوٹ رہی ہے سنّاٹے کی گونج
دل ہے تنہا کونج

۱۰
۴
۶۸

آشوبِ آگہی

کوئی بتلائے مجھے
میرے ان جاگتے خوابوں کا مقدّر کیا ہے ؟
میں کہ ہر شئے کی بقا جانتا ہوں
اُڑتے لمحوں کا پتا جانتا ہوں
سرد اور زرد ستاروں کی تگاپُو کیا ہے
رنگ کیا چیز ہے خوشبو کیا ہے ،
صبح کا سحر ہے کیا ، رات کا جادُو کیا ہے ،
اور کیا چیز ہے آوازِ صبا جانتا ہوں ۔

ریت اور نقشِ قدم ، موج کا رم
آنکھ اور گوشۂ لب ، زلف کا خم
شام اور صبح کا غم
سب کی قسمت ہے فنا جانتا ہوں

پھر بھی یہ خواب مرے ساتھ لگے رہتے ہیں
جاگتے خواب کہ جن کی کوئی تعبیر نہیں
کوئی تفسیر نہیں
صورتِ زخم ہرے رہتے ہیں
میرے ہاتھوں سے پرے رہتے ہیں۔

آگہی جہل سے بدتر ٹھہری،
جاگتے خواب کی تعبیر مقدّر ٹھہری
زندگی میرے لیے گنبدِ بے در ٹھہری،
میں کہ آوازِ صبا جانتا ہوں
اُڑتے لمحوں کا پتا جانتا ہوں
اور ہر شے کی بقا جانتا ہوں

۲۸
۵
۶۸

ویت نام

آگ اور آگ ہی آگ
خون اور خون ہی خوں
ارضِ ویتنام کے فردوس نظر خطّے میں
جتنے پتھر تھے لہو رنگ ہوئے
جو فسوں خیز ہوا
اس مہکتی ہوئی وادی میں چلا کرتی تھی
اس قدر گرم ہوئی
خوشبوئیں بھاپ بنیں، سرو و سمن راکھ ہوئے
سینکڑوں پھول سے بچّوں کے بدن راکھ ہوئے
خاک کی پیاس بجھے گی کب تک
یہ زمیں خون پیئے گی کب تک !
اپنی ہی گود میں کھیلے ہوئے جسموں کا لہو !
اُن تڑپتی ہوئی ماؤں کا لہو

چھاتیاں جن کی لہو ریز ہوئیں
دودھ پیتے ہوئے بچّوں کا لہو
سسکیاں جن کی سکوں خیز ہوئیں،
اور پردیس میں لڑتے ہوئے لوگوں کا لہو
جن کو اس خون کے بہنے کا سبب یاد نہیں۔
سینکڑوں میل پرے
جن کی مرتی ہوئی مائیں ہر دم
اُن کے جینے کی دعا مانگتی ہیں۔
بیویاں چیختے بچّوں سے یہی کہتی ہیں
"وار آفس نے لکھا ہے، پاپا
صرف زخمی ہے بہت جلد چلا آئے گا
ٹام اور جَم کے لیے ڈھیر سے تحفے لے کر
اور سوزی کے لیے خاص ویتنام کا سلور نیکلس"
اور پھر رات کی کالی چپ میں
اپنے گزرے ہوئے لمحوں کے لیے روتی ہیں۔

۲۶
۶
۶۸

آواز کے پتّھر

کون آئے گا!
شب بھر گرتے پتّوں کی آوازیں مجھ سے کہتی ہیں
کون آئے گا!
کس کی آہٹ پر مٹّی کے کان لگے ہیں!
خوشبو کس کو ڈھونڈ رہی ہے!
شبنم کا آشوب سمجھ
اور دیکھ کہ ان پھُولوں کی آنکھیں
کس کا رستہ دیکھ رہی ہیں
کس کی خاطر
قریہ قریہ جاگ رہا ہے
سُونا رستہ گونج رہا ہے
کس کی خاطر!!

تنہائی کے ہول نگر میں
شب بھر گرتے پتّوں کی آوازیں چُنتا رہتا ہوں
اپنے سر پہ تیز ہوا کے نوحے سُنتا رہتا ہوں —

۵/۷/۶۸

دائرہ

سوچ کی دُوریاں
رُوح کے آئینے کے لیے زنگ ہیں
ہم وہ دیوار ہیں
جس کی تعمیر میں جس قدر سنگ ہیں
سارے یک رنگ ہیں۔
اہلِ بینش ہمیں دیکھ کر دنگ ہیں،
سوچتے ہیں کہ یہ لوگ کیا چیز ہیں،
"سینکڑوں میل کا اجنبی فاصلہ
ان کے اک ساتھ اُٹھتے ہُوئے پاؤں کی گرد ہے
ان کا جو فرد ہے
اس کے احساس میں ایک ہی درد ہے"

قربِ احساس کے بے نشاں، بے زباں
جتنے آہنگ ہیں
سب ہمارے لیے ایک ہی گیت کے
مختلف انگ ہیں۔

سوچ کی دُوریاں
روح کے آئینے کے لیے زنگ ہیں۔
ہم جہاں پر بھی ہوں، جس طرح بھی رہیں
اپنی پرواز کا راستہ ایک ہے
ابتدا ایک تھی، انتہا ایک ہے

۱۹
۷
۶۸

رابطے

ہاں ابھی سوچ لے ،
فیصلوں کا سفر
لفظ کی نرم چھاؤں میں کٹتا نہیں ،
اور سُن
فیصلوں کی ندامت سے تکلیف دہ کوئی بھی دُکھ نہیں ،
جتنے خدشے مرے ساتھ چلنے میں ہیں
اس دوراہے پہ رُک
اور اُنھیں اپنی آنکھوں میں ترتیب دے
جان لے
وقت کے دشتِ بے برگ میں واپسی کے لیے کوئی رستہ نہیں ،
(منظروں کا نیا پن پرانی رُتوں کے لیے موت ہے)
جو ہوا میرے جملے کے آغاز میں

تیرے بالوں کو چھُوتے ہوُے چل رہی تھی اُسی وقت سے
مر چکی ہے کہ اب
اُس کا ہونا نہ ہونا ترے واسطے ایک ہے
(اور تجھ کو پتہ ہے کسی چیز کی
زندگی اُس تعلّق سے ہے جو کسی ذات کے رابطے سے بنے)
ہاں یہی وقت ہے
رابطے اور تعلّق کے معنی سمجھ،
جتنے خدشے مرے ساتھ چلنے میں ہیں
اس دوراہے پہ رُک
اور اُنھیں اپنی آنکھوں میں ترتیب دے
کہ ابھی تیرے ہاتھوں کا ہر رابطہ
تیرے ہاتھوں میں ہے۔

۲۹
۷
۶۸

آخری بات

طلوعِ شمسِ مفارقت ہے،
پُرانی کرنیں
نئے مکانوں کے آنگنوں میں لرز رہی ہیں،
فصیلِ شہرِ وفا کے روزن
چمکتے ذرّوں سے بھر گئے ہیں، چمکتے ذرّے!
گئے دنوں کی عزیز باتیں
نگار صبحیں، گلاب راتیں
بساطِ دل بھی عجیب شے ہے
ہزار جیتیں، ہزار ماتیں
جدائیوں کی ہوائیں لمحوں کی خشک مٹی اُڑا رہی ہیں۔
گئی رُتوں کا ملال کب تک!
چلو کہ شاخیں تو ٹوٹتی ہیں
چلو کہ قبروں پہ خون رونے سے اپنی آنکھیں
ہی پھوٹتی ہیں

یہ موڑ وہ ہے جہاں سے میرے
تمھارے رستے بدل گئے ہیں
(پرانی راہوں پہ لوٹنا بھی ہماری تقدیر میں نہیں ہے)
کہ راستے بھی ہمارے قدموں کے ساتھ آگے
نکل گئے ہیں

طلوعِ شمسِ مفارقت ہے
تم اپنی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے ستاروں
کو موت دے دو
گئی رُتوں کے تمام پھولوں تمام خاروں
کو موت دے دو،
نئے سفر کو حیات بخشو
کہ پچھلی راہوں پہ ثبت جتنے نقوشِ پا ہیں
غبار ہوں گے۔
ہوا اُڑائے کہ تم اُڑا دو ——— !

۲۵
۹
۶۸

ہوائے شہرِ وفا شعاراں

ہوائے شہرِ وفا شعاراں
ہماری بستی کے پاس آئی تو ہم نے دیکھا
کہ اُس کے دامن میں بوئے مقتل بسی ہوئی تھی
اور اُس کی پھیلی ہوئی نگاہوں میں خوں کی سُرخی
چھلک رہی تھی۔
ہماری بستی کے پیڑ ششدر تھے سرد گلیاں،
مکاں، دریچے سبھی تعجّب سے تک رہے تھے
عجیب طرزِ خرام تھا وہ کہ چلنے والے ٹھٹک رہے تھے!

ہوا چھتوں کے سپاٹ ماتھوں کو چھُو کے گزری
تو کھڑکیوں کے نصیب جاگے
کہ آج بستی کی ساری خلقت کواڑ کھولے ہوئے کھڑی تھی

ہر ایک نتھنے پُھلا پُھلا کے ہوا کی خوشبو کو سونگھتا تھا
کہ جس میں خوں کی مہک رچی تھی۔
تمام سینوں میں ایک خدشہ سوال بن کر دھڑک رہا تھا
تو آج شہرِ وفا شعاراں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا
ہوا نے چپکے سے سر ہلایا،
ہوا نے چپکے سے سر ہلایا تو کھڑکیوں کے کواڑ کانپے
تو بیبیوں نے کُھلے سروں سے امیرِ مقتل کو بد دعا دی
کہ جس کا خوفِ مہیب بستی کے چار جانب تنا ہوا تھا
اور اپنے مردوں کو چوڑیاں دیں
کہ اُن کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا۔

ہوا کی پاگل بنانے والی مہک نے دیوار و در سے پوچھا
تمھاری غیرت کو کیا ہُوا ہے؟
یہ کن مکینوں میں رہ رہے ہو!
تمام بستی پکار اُٹھی
قسم شہیدوں کے بہتے خوں کی

قسم سویروں کی، چاندراتوں کی
آبشاروں کی اور بچوں کی ہم نے مقتل کو چُن لیا ہے،
قسم ہے اُن کی کہ جن کے آنسو ہماری ہستی سے معتبر ہیں
اور اُن کی جن کے بدن ہمارے لہو سے تخلیق پا رہے ہیں
اور اُن کی جن کے جوان بوسوں میں سُرخ پھولوں کی تازگی ہے
کہ ہم نے مقتل کو چُن لیا ہے
ہوائے شہرِ وفا شعاراں، گواہ رہنا
گواہ رہنا کہ ہم نے خوفِ مہیب بستی کے بام و در سے ہٹا دیا ہے
ہمارے خوں سے مہک کے اُٹھے تو اگلے شہروں کی سمت جانا
اُنھیں بتانا
وفا کا رستہ سروں کی کثرت سے پٹ گیا ہے
کہ سرفروشی کی ابتدا ہے،
اُنھیں بتانا کہ صحنِ مقتل بنا ہُوا ہے کوئے نگاراں
ہوائے شہرِ وفا شعاراں، ہوائے شہرِ وفا شعاراں

۲۳
۱۱
۶۸

دوسری جُدائی

تری خوشبو
ہوا کے سبز دامن میں بسی
تو سوچ نے آنکھوں میں خواہش کے دریچے کھول کر دل سے کہا
"خدا شاہد
کہ ہم نے آج تک بچھڑے ہوؤں کو پھر کبھی ملتے نہیں دیکھا،
مگر حیرت سماعت پر کہ یہ آہٹ اُسی کی ہے
جسے تم نے گنوایا تھا۔
جدائی کی ہوا جس کے مہکتے جسم کی خوشبو سے خالی تھی
جسے کھونے کا لمحہ ہر نئے موسم کا حاصل تھا
ستارے جس کی صورت دیکھنے ہر شب نکلتے تھے
نظارے ہاتھ ملتے تھے

(۲)

یکایک شہر کی گلیوں میں اُس کے نام کی خوشبو اُڑی میں نے
رفاقت کے پرانے نرم لہجے میں اُسے آواز دی
اُس نے مجھے دیکھا
مگر اُس کی نگاہوں سے فقط حیرت ہویدا تھی
کہ جیسے پوچھتا ہو اس تخاطب کا سبب کیا ہے!
وہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی خوش وضع پیکر تھا
کہ جیسے موسموں کا گھُن اُسے چھونے سے قاصر ہو!
میں بچے کی طرح ششدر کھڑا تھا
اُس نے بالوں کو جھٹک کر ڈوبتے سورج کو گھورا
راستے کو آنکھ میں تولا، مجھے دیکھا
"سفر لمبا ہے" وہ بولا،
مری منزل تمھاری رہگزر سے سینکڑوں فرسنگ آگے ہے
خدا حافظ!

۱۲
۱۲
۶۸

نوحۂ غم ہی سہی

اے غمِ یار ٹھہر آج کی شب!
لگ چکی تیری سیاہی دل پر
آ چکی جو بھی تباہی، دل پر
زرد ہے رنگ نظر، آج کی شب
خاک کا ڈھیر ہوئے خواب نگر
آج کی شب
اے غمِ یار ٹھہ آج کی شب

کم نظر دیکھ ہوا کی آہٹ
کس کی خوشبو میں بسی آتی ہے!
کون سا عکس ہے جس کی خاطر
آنکھ آئنہ بنی جاتی ہے!

کس طرح چاند اچانک جھک کر
سرد شاخوں سے لپٹ جاتا ہے
کس طرح رنگِ چمن
ایک چہرے میں سمٹ جاتا ہے
سیلِ امواجِ تمنّا کیسے
ساحلِ دل سے پلٹ جاتا ہے!
اور کس طور سے طے ہوتا ہے
لڑکھڑاتے ہوئے تاروں کا سفر آج کی شب
بے ہنر آج کی شب
مجھ کو جی بھر کے اُسے یاد تو کر لینے دے
دولتِ درد سہی جیب تو بھر لینے دے۔

بے نام منزلوں کا سفر

ہوا نظر کے تہی دریچوں میں جانے والے کو ڈھونڈتی ہے —
گلِ تماشا نجانے کب اور کہاں سے پھوٹے!
ہر ایک منظر پہ اُس کی خوشبو نے حیرتوں کے عَلم گڑے ہیں
تلاش رستے بہت کڑے ہیں —
کہیں سے شمسِ مراد اُبھرے تو سحرِ شب ہائے کہر ٹوٹے
بکھرتے خوابوں کا ساتھ چھوٹے
گزرتے لمحوں کا راستہ بھی عجیب جادو کا سلسلہ ہے
کہ میں کھڑا ہوں یہ چل رہا ہے
کہیں وہ غوغا کہ بات مشکل، کہیں وہ چپ کہ حیات مشکل
کہیں وہ عالم کہ سانس اٹکے کہیں ہوا سے نجات مشکل
ہر ایک سائے میں اُس کا پیکر عجیب جادو جگا رہا ہے
اُسی کی خوشبو ہر ایک منظر کی زندگی ہے
کہ جس کی ذقت کے سرد وقفے نے آرزو کے جہان لُوٹے
گلِ تماشا نجانے کب اور کہاں سے پھوٹے
ہوا نظر کے تہی دریچوں میں جانے والے کو ڈھونڈتی ہے

۵/۲/۶۹

سمندر، آسمان اور میں

کھُلیں جو آنکھیں تو سر پہ نیلا فلک تنا تھا
چہار جانب سیاہ پانی کی تند موجوں کا غلغلہ تھا۔
ہوائیں چیخوں کو اور کراہوں کو لے کے چلتی تھیں اور مٹی
کی زرد خوشبو میں موت موسم کا ذائقہ تھا۔
نظر مناظر میں ڈوب کر بھی مثالِ شیشہ تہی تھی یعنی
گُلِ تماشا نہیں کھِلا تھا
ہراس جذبوں کی رہ گزر میں دلِ تعجب زدہ اکیلا،
خموش، تنہا بھٹک رہا تھا۔

کہ ایک سائے کی نرم آہٹ نے راستوں کا نصیب بدلا
کوئی تعلق کے چاند لہجے میں اپنے پن کی ادا سے بولا

"مرے مسافر اُداس مت ہو کہ عہدِ فرقت ہی زندگی ہے
یہ فاصلوں کی خلیج راہِ وصال ہے اور طلب نگاہوں
کی روشنی ہے

تمام چیزیں تمھارے میرے
بدن کے رشتوں کا سلسلہ ہیں
تمھیں خبر ہے کہ ہم سمندر
اور آسمانوں کی انتہا ہیں!"

۶
۲
۶۹

اِسرافیل کہاں ہے

بستیوں میں ظلم کا پرچم کھُلا
لوگ پھر اندھے سفر کی راہ میں حائل ہوُئے
پھر طلسمِ بابِ شہرِ غم کھُلا
پھر بدن سڑکوں پہ گرتے خوں سے اپنی کشمکش کی داستاں لکھنے لگے!
چوک دشتِ ہول کا منظر بنے!
مرمریں باہنوں میں ٹوٹی چوڑیوں کی کرچیاں اُتریں
تو سینے یاد کے محشر بنے!
پھر کئی ماؤں کی آنکھیں زینتِ در ہوگئیں اور منتظر کانوں میں
کھوئی آہٹوں کے گھر بنے!
آرزو کے راستے پتھّر بنے!

جبر کی منزل میں ہے! — ہر ایک شے
کیوں زمیں پھٹتی نہیں، اندھیر ہے!
آسمانو، دیکھتے ہو کس کا منہ
کیا دیر ہے!

کوہسارو، روئی کے گالے بنو
اور اے سمندر، ساحلوں کے باب سے باہر نکل
نقشِ فردا خواب سے باہر نکل —

۱۵
۲
۶۹

بُزدل

ہجومِ سنگِ انا اور ضبطِ پیہم نے
مثالِ ریگِ رواں بے قرار رکھا ہے
مرے وجود کی وحشت نے رات بھر مجھ کو
غبارِ قافلۂ انتظار رکھا ہے
بہ پیشِ خدمتِ چشمِ سراب آلودہ
ہوا نے دستِ طلب بار بار رکھا ہے۔

میں تیری یاد کے جادو میں تھا، سحر مجھ کو
نجانے کون سی منزل پہ لا کے چھوڑ گئی
کہ سانس سانس میں تیرے بدن کی خوشبو ہے
قدم قدم پہ تری آہٹوں کا ڈیرا ہے
مگر نظر میں فقط شب زدہ سویرا ہے

تہی تہی سے مناظر ہیں گرد گرد فضا
متاعِ عمر وہی ایک خواب تیرا ہے

ترے جمال کا پرتو نہیں مگر پھر بھی
خیال آئنہ خانہ سجائے بیٹھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھاتا ہوں ایک وحشت ہے
تو ہی بتا کہ کہاں تک فریب دوں خود کو!
کہ میرا عکس مرے خوف کی شہادت ہے،

مرا وجود ہے اور شہرِ سنگباراں ہے
بچاؤں جان کہ تعمیرِ قصرِ ذات کروں!
میں اپنا ہاتھ بغل میں دبائے سوچتا ہوں
مرے نصیب میں سورج کہاں جو بات کروں،

میں وادیوں کی مسافت سے کس لیے نکلوں
سفر اک اور پہاڑوں کے پار رکھا ہے

۳/۴/۶۹

گھروں سے نکلے ہو اب تو دیکھو

کہا ہواؤں نے جانے والو،
گئے ہوؤں کی تلاش کارِ فضول ہے کہ سراغِ رفتہ کِسے ملا ہے!
یہ تم جو آنکھوں میں آرزوؤں کے جھلملاتے چراغ لے کر
سیاہیوں میں بھٹک رہے ہو، تمہی بتاؤ
زمینِ مُردہ سے کوئی غنچہ کبھی کِھلا ہے!

خیال رستے خواب فطرت امین ہیں
جو گئے ہوؤں کے عزیز قدموں کی سرگزشتیں سنا رہے ہیں
گلاب جسموں کی سبز خوشبو اور آہٹوں کی حیات دستک
سے وصل خواہش جگا رہے ہیں۔

مگر جو پوچھو کہ اب کہاں ہیں
وہ شوق چہرے، سوال آنکھیں!
تو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ جیسے الفاظ اپنے معنی سے کٹ گئے ہوں
غبارِ الہام بے نشاں ہیں تمام جملے سمٹ گئے ہوں

کہا مسافت نے جانے والو،
سفر بلاؤں کا اک سمندر ہے جو سراپا بھنور بھنور ہے
گئے ہوؤں کا خرام سیلِ ہوائے صحرا سا بے اماں ہے
کہ جو مقاموں سے بے خبر ہے
سراب آنکھوں سے معتبر ہے
ہر ایک منظر کے بازوؤں پہ قبائے رنگِ زوال ہے اور
شکست خوابوں کی ہم سفر ہے۔

کہا ستاروں نے جانے والو،
مگر پرانے بہار رشتوں کی اُستواری کا شوق راہِ وصال ہے
اور بازگشتِ حروفِ کہنہ میں لفظِ تازہ کی زندگی ہے۔
گھروں سے نکلے ہو اب تو دیکھو
سکونِ مرگِ وجود ہے اور تلاش آنکھوں کی روشنی ہے
کہ تیرگی کے سفر کی منزل گئے ہوؤں سے دمک رہی ہے

جادو کا شہر

حرف لفظوں سے جُدا ہیں
کور چشمِ باز ہے
کون سا دشمن ہے میرا
کون سا ہمراز ہے
سینکڑوں چہرے ہیں لیکن
آشنا کوئی نہیں
ایک سی شکلیں ہیں سب کی
ایک سی آواز ہے۔

٥
٦
٦٩

اندیشہ

ضروری نہیں ہے،
ضروری نہیں ہے جو ساحل کی گیلی خنک ریت پر
ہاتھ میں ہاتھ دے کر
سفر اور تلاطم کے قصّے سُنائے،
جزیروں، ہواؤں اور اَن دیکھے موسم
اور آنکھوں سے اوجھل کناروں پہ بکھرے
ہُوے منظروں، ذائقوں اور رنگوں کی باتیں کرے
وہ ان وارداتوں سے گزرا بھی ہو

گر کہے، آؤ ہم ان پریشان موجوں کا پیچھا کریں
جو ترے اور مرے پاؤں کو چومتی ہیں

تلاطم کی بے نام منزل سے گزریں
یہ دیکھیں ہوائیں کسے ڈھونڈتی ہیں
تو چلنے سے پہلے ذرا سوچ لینا
ضروری نہیں ہے جو اَن دیکھے رستوں کی خبریں سنائے
وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو
کہیں یہ نہ ہو جب سمندر میں تم اُس کو ڈھونڈو تو وہ
ساحلوں پہ کھڑا مسکراتا رہے۔

۵
۶
۶۹

تجدید

اب مرے شانے سے لگ کر کس لیے روتی ہو تم!

یاد ہے، تم نے کہا تھا،

"جب نگاہوں میں چمک ہو

لفظ جذبوں کے اثر سے کانپتے ہوں اور تنفّس

اس طرح الجھیں کہ جسموں کی تھکن خوشبو بنے،

تو وہ گھڑی عہدِ وفا کی ساعتِ نایاب ہے۔

وہ جو چپکے سے بچھڑ جاتے ہیں لمحے ہیں مسافت

جن کی خاطر پاؤں پر پہرے بٹھاتی ہے۔

نگاہیں دُھند کے پردوں میں اُن کو ڈھونڈتی ہیں

اور سماعت اُن کی میٹھی نرم آہٹ کے لیے

دامن بچھاتی ہے۔"

اور وہ لمحہ بھی تم کو یاد ہو گا

جب ہوائیں سرد تھیں اور شام کے میلے کفن پر

ہاتھ رکھ کر

تم نے لفظوں اور تعلّق کے نئے معنی بنائے تھے، کہا تھا
"ہر گھڑی اپنی جگہ پر ساعتِ نایاب ہے
حاصلِ عمرِ گریزاں ایک بھی لمحہ نہیں
لفظ دھوکہ ہیں کہ ان کا کام ابلاغِ معانی کے علاوہ کچھ نہیں،
وقت معنی ہے جو ہر لحظہ نئے چہرے بدلتا ہے۔
جانے والا وقت سایہ ہے
کہ جب تک جسم ہے یہ آدمی کے ساتھ چلتا ہے،
بادِ مثلِ نطق پاگل ہے کہ اس کے لفظ معنی سے تہی ہیں۔
یہ جیسے تم غم، اذیّت، درد، آنسو
دُکھ وغیرہ کہہ رہے ہو
ایک لمحاتی تأثر ہے تمہارا وہم ہے،
تم کو میرا مشورہ ہے، بھُول جاؤ تم سے اب تک
جو بھی کچھ میں نے کہا ہے۔"
اب مرے شانے سے لگ کر کس لیے روتی ہو تم!

۷
۷
۶۹

اے دلِ بے خبر

اے دلِ بے خبر
جو ہوا جا چکی اب نہیں آئے گی
جو شجر ٹوٹ جاتا ہے پھلتا نہیں،
واپسی موسموں کا مقدّر تو ہے
جو سماں بیت جائے پلٹتا نہیں
جانے والے نہیں لوٹتے عمر بھر
اب کسے ڈھونڈتا ہے سرِ رہ گزر
اے دلِ کم نظر، اے مرے بے خبر، اے مرے ہم سفر
وہ تو خوشبو تھا اگلے نگر جا چکا
چاندنی تھا ہوا صرفِ رنگِ قمر
خواب تھا آنکھ کھلتے ہی اوجھل ہوا

پیڑ تھا رُت بدلتے ہوئے بے ثمر
اے دلِ بے اثر، اے مرے چارہ گر
یہ ہے کس کو خبر!
کب ہوائے سفر کا اشارہ ملے!
کب کھُلیں ساحلوں پر سفینوں کے پر!
کون جانے کہاں منزلِ موج ہے!
کس جزیرے پہ ہے "شاہ زادی" کا گھر، اے مرے چارہ گر
اے دلِ بے خبر، کم نظر، معتبر
تو کہ مدّت سے ہے زیرِ بارِ سفر
بے قرارِ سفر
ریل کی بے ہنر پٹریوں کی طرح
آس کے، بے ثمر موسموں کی طرح
بے جہت منزلوں کی مسافت میں ہے
رستہ بھُولے ہوئے رہروؤں کی طرح
چوبِ تارِ سفر،
اعتبارِ نظر — اعتبارِ نظر کس گماں پہ کریں

اے دلِ بے بصر
یہ تو ساحل پہ بھی دیکھتی ہے بھنور
ریت میں کشت کرتی ہے آبِ بقا
کھولتی ہے ہواؤں میں بابِ اثر
تجھ کو رکھتی ہے یہ زیبِ دارِ سفر، بے قرارِ سفر
اے دلِ بے ہُنر،
گرم سانسوں کی وہ خوشبوئیں، بھول جا
وہ چہکتی ہُوئی دھڑکنیں، بھُول جا
بھول جا نرم ہونٹوں کی شادابیاں
حرفِ اقرار کی لذّتیں، بھُول جا
بھول جا وہ ہوا، بھول جا وہ نگر
کون جانے کہاں روشنی کھو گئی
لُٹ گیا ہے کہاں کاروانِ سحر!
اب کہاں گیسوؤں کے وہ سائے، کہاں
اُس کی آہٹ سے چمکے ہُوئے بام و در، اے دلِ بے بصر

رنگِ آسودگی کے تماشے کہاں
جھٹپٹا ہے یہاں رہگزر رہگزر،
وہ تو خوشبو تھا اگلے نگر جا چکا
اب کسے ڈھونڈتا ہے ارے بے خبر،
جانے والے نہیں لوٹتے عمر بھر
اے دلِ کم نظر، اے مرے چارہ گر، اے مرے ہم سفر

باز دید

میں بھولا نہیں ہوں محبّت کا وہ سب سے دشوار لمحہ
وہ لمحہ جو اُس دن مرے واسطے لمحۂ آخری بن رہا تھا
جدائی کا وہ موت آثار لمحہ، وہ تلوار لمحہ
وہ سوئی ہوئی شب کا بیدار لمحہ۔
وہ تم اور تمھارا وہ پژمردہ چہرہ وہ سہمی نگاہیں
وہ ہونٹوں کے گوشوں پہ سمٹی کراہیں
ہراساں قدم اور پریشان باہیں
وہ آنسو وہ آہیں،
مری آنکھ میں آج تک نقش ہے وہ لرزتا ہُوا سا پُر اسرار لمحہ
وہ دیوار لمحہ
مجھے یاد ہے تم بہت دیر تک میرے شانے پہ موتی سجاتے رہے تھے
مری گرم بانہوں میں لپٹے ہُوئے کپکپاتے رہے تھے

جدائی کی تمہید میں ایک لمبی پُرانی کہانی سناتے رہے تھے،
مجھے ساتھ اپنے رُلاتے رہے تھے،
میں بھولا نہیں ہوں تعلّق کی باتیں
کہ میرے لبوں پر تمھارے لبوں کے کھلائے ہُوئے سب شگوفے جواں ہیں
تمھارے بدن کی وہ سب واردا تیں، مرے سرد ہاتھوں پہ اب تک عیاں ہیں
وہ قربت کی خوشبو میں سرشار لمحے، مرے چار جانب ابھی تک رواں ہیں
زمانہ بھی لیکن عجب سحر زا چیز ہے
جو ابھی لب پہ کرنیں سجائے کھڑا تھا ابھی اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے
ہر اک پل نئی شکل میں ڈھل رہا ہے،

میں بھولا نہیں ہوں
جُدائی کا وہ موت آثار لمحہ، وہ تلوار لمحہ
جو اُس دن مرے واسطے لمحۂ آخری بن رہا تھا
مگر اب ہے صرف ایک بے کار لمحہ۔

۵/۹/۶۹

جائزہ

رستہ رستہ، تنہائی کی گرد اُڑی
اور جب میں کالے کوس گزر کر اُس کی رہ پر آن لگا تو
رسوائی نے شہر سے باہر آکر استقبال کیا،
ہر جانب سے شعلہ بار نگاہیں اُٹھیں، آوازوں کے پتّھر برسے
ناکامی کے زہر میں ڈوبے خنجر برسے،
سفر سے تو میں بچ نکلا تھا منزل نے پامال کیا۔

میں نے رک کر زخمی پاؤں، خاک بھرے سر، بوجھل آنکھوں
پیاس سے سوکھے خشک لبوں
اور اُس کے شہر کی اونچی، پکی سرخ فصیلوں کو دیکھا
اور اپنے ششدر دل سے پوچھا

"اسی لیے کیا مجھ کو اتنی دُور سے لے کر آیا تھا!
یہی نگر تھا جس کے انوکھے بام و در کے
مہکی گلیوں، اُجلے کوچوں، چہروں سے آباد دریچوں
اور وفا کے پھول کھلاتے شام و سحر کے
کومل، میٹھے خواب دکھا کر
مجھ کو اتنے خاک اُڑاتے کالے کوس چلایا تھا!
مجھ سے میرا اپنا شہر چھڑایا تھا"

خلقت کے آوازے تو میں اپنے گھر میں بھی سُنتا تھا
وہاں بھی گلیوں، بازاروں سے سنگِ ملامت ہی چُنتا تھا
گھر تھا تو دروازہ بھی تھا،
لوگوں سے چھپ سکتا تھا
دیواریں تھیں جن سے لگ کر رو سکتا تھا
خاموشی تھی، سو سکتا تھا۔

۲۱
۱۰
۶۹

ایک کہانی

میں تنہا تھا سرد ہوا تھی
رات کے پچھلے پہر کی کالی خاموشی تھی
پیڑوں کے چہروں پہ اک بے نام تحیّر تھا جیسے وہ
میرے پیچھے کوئی دشمن دیکھ رہے ہوں،
دُور دُور تک چاروں جانب ویرانی کا جال تنا تھا،
میں اس منظر کی ہیبت سے خائف تھا
اور اپنے دل میں سوچ رہا تھا،

آگے میرے دوست کھڑے ہیں
جنگل کے اُس پار نہایت بے چینی سے
میرا رستہ دیکھ رہے ہیں،
اُن کی رس میں ڈوبی باتیں، چاہت سے معمور نگاہیں
پھیلی باہیں
میرے غم کا مرہم ہوں گی
سفر صعوبت سن کر اُن کی آنکھیں شبنم شبنم ہوں گی
جب میں اُن کو وہ سب چیزیں جو میں جنّوں
اور دیووں سے لڑ کر لایا ہوں، دوں گا تو اُن کے چہرے کھل اُٹھیں گے
وہ پوچھیں گے ا.....
ابھی میں دل میں اُن کے سوالوں کے جملے ہی سوچ رہا تھا۔
یکدم مجھ پر جانے کہاں سے کچھ سائے سے ٹوٹ پڑے
میرے سینے اور کندھوں میں اُن کے ٹھنڈے خنجر اُترے
خوں بہا تو میں نے بچنے کی کوشش میں اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے
لیکن میرے ہاتھ نہیں تھے!

میری آنکھوں کے آگے سے ساری چیزیں
ڈوب رہی تھیں، سائے مجھ پر
جھپٹ جھپٹ کر وہ سب چیزیں لوٹ رہے تھے
جن کی خاطر میرے ساتھی جنگل کے اُس پار کھڑے تھے!
یکدم اک بجلی سی چمکی
میں نے اُن سایوں کو دیکھا، میں نے دیکھا اور پہچانا
وہ سب میرے..... وہ سب میرے..... وہ.... سب.... میرے

۱۵
۱۱
۶۹

سلسلے خیالوں کے

مگر وہ مجھ سے عظیم تر ہے
مرے تعلّق بغیر اس کا وجود ہر چند بے اثر ہے
مگر وہ مجھ سے عظیم تر ہے
گزرنے لمحو، مجھے بتاؤ کہ زندگی کا اصول کیا ہے
تمام چیزیں اگر حقیقت میں ایک ہی ہیں
تو پھول کیوں ہے، ببول کیا ہے!
جو میری آنکھوں کے دائرے میں ہزار رنگوں میں منتشر ہے
ہر ایک منظر، ہر ایک آہٹ، ہر ایک رستے کا ہم سفر ہے
کہیں سمندر سا محوِ حیرت کہیں ہواؤں سا بے خبر ہے
کہیں بیاباں مثالِ خالی، کہیں صداؤں سے پُر نگر ہے
یہ سب تماشا، مری ہی خواہش کا عکس گر ہے
تو پھر بتاؤ، سوائے خواہش کے میرے ہاتھوں میں کیا ہُنر ہے

گھروں سے نکلو تو سوچ لینا
کہ بے گھری کا حصول کیا ہے!
دلوں کی تعمیر مت گراؤ کہ خواہشوں کا یہی تو گھر ہے۔

(۲)

تمام ہاتھوں میں آئینے ہیں تو کون کس سے چھپا ہُوا ہے!
اگر صدا کا وجود کانوں سے منسلک ہے
تو کون خوشبو میں بولتا ہے!
اگر سمندر کی حد ہے ساحل
تو کون آنکھوں میں پھیلتا ہے!
تمام چیزیں اگر یہی ہیں
تو کون چیزوں سے ماورا ہے،
کسے خبر ہے بدلتی رُت نے پُرانے پتّوں سے کیا کہا ہے،
یہ کون بادل سے جا کے پُوچھے کہ اتنے موسم کہاں رہا ہے!
جو آج دیکھا ہے کل نہ ہوگا
کوئی بھی لمحہ اٹل نہ ہوگا

اگر زمیں پر تمہارے میرے قدم نہ پڑتے تو کون ہوتا!
یہ ایسا جادُو ہے جو حسابوں سے حل نہ ہوگا۔
ہزار منظر قدم سے لپٹیں گزرنے والے نہیں رکیں گے،
ہوا جو تحریر لکھ کے جائے گی
اُس پہ کوئی عمل نہ ہوگا۔
ذرا تمنّا کی شکل دیکھو تمہارے آنے کی منتظر ہے۔

(۲۳)

"ہواؤ اُس کی گلی سے گزرو تو اُس کو میرا سلام کہنا"
مجھے خبر ہے کہ میرے گھر سے گزرنے والی ہوا کا رستہ
تمہارے گھر تک نہیں گیا ہے،
سلام میرا تمہارے کانوں سے نارسا ہے
میں جانتا ہوں یہ بچپنا ہے
مگر حقیقت کو جان کر بھی نہ جاننے میں عجب مزا ہے
ہوا سے میں نے یہ پھر کہا ہے،
"گزر رہے ہیں تمہاری یادوں کے دم سے ہی صبح و شام کہنا

ہوا تو اُس کی گلی سے گزرو تو اُس کو میرا سلام کہنا"
تمھارے گھر کا کِسے پتہ ہے ہوا کے رُخ کی کسے خبر ہے!!

(۴)

گزرتے لمحو، میں تھک گیا ہوں، بکھر گیا ہوں
میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں،
یہ ساتھیوں کی مفارقت بھی عجیب شے ہے
کہ جتنا عرصہ یہ ساتھ چلتے ہیں
چھوٹی چھوٹی فضول باتوں پہ روٹھ جاتے ہیں اور لڑتے ہیں
دوستوں کے جواں ارادے شکست کرتے ہیں
راستے کی صعوبتوں سے انھیں ڈراتے ہیں آپ ڈرتے ہیں
منزلوں کو پکارتے ہیں
مگر انھی کے وجود ہیں جو مسافتوں کو نکھارتے ہیں
گزرتے لمحو میں ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں
میں اپنی تنہائی کے تحیّر سے ڈر گیا ہوں،
میں وہ مسافر ہوں جس کے پاؤں میں منزلیں ہیں نہ رہگزر ہے

(۵)

مری نگاہوں کے آئنوں میں عجیب منظر جھلک رہے ہیں
کہیں اُجالوں پہ تیرگی ہے کہیں اندھیرے چمک رہے ہیں
کہیں شگوفوں میں روشنی ہے کہیں دریچے مہک رہے ہیں
کہیں پہ صدیاں رُکی کھڑی ہیں کہیں زمانے بھٹک رہے ہیں
سفر ہے کیسا کہ میرے پاؤں بغیر چلنے کے تھک رہے ہیں
میں اپنی آنکھوں میں جھلملاتے گئے زمانوں کو دیکھتا ہوں
گئے زمانے، کہ جن کے شانوں سے سبز آنچل ڈھلک رہے ہیں
گئے زمانے، وہ کارواں ہیں کہ جن کے رکنے میں بھی سفر ہے۔

(۶)

خموش پیڑ! د

تمھارے سائے میں کتنی نسلوں نے دم لیا ہے
مجھے بتاؤ کہ موٹروں کے دھوئیں سے پہلے جو گرد اُڑتی تھی
اُس کے پردے سے آنے والے مسافروں میں کمال کیا تھا
مجھے بتاؤ کہ مجھ سے پہلے گئے ہوؤں کا جمال کیا تھا

تمھاری آنکھیں تو چاند سورج کی ابتداؤں سے آشنا ہیں
مجھے بتاؤ کہ پہلے سورج کا حال کیا تھا
تمھارے شانوں پہ چاندنی کی طویل زلفیں بکھر کے مہکیں
تو آسماں کو ملال کیا تھا،
تمھارے قدموں میں سر جھکاتے اُداس رستے کی بندگی میں
سوال کیا تھا
ہوائیں پہلی دفعہ چلیں تو تمھارے دل میں خیال کیا تھا
تمھاری شاخوں نے کن گھٹاؤں کی بے قراری سے نم لیا ہے
مجھے بتاؤ جو سب سے پہلے
تمھارے سائے میں آکے ٹھہرا تھا اُس مسافر کی کیا خبر ہے!

(۷)

اُجاڑ شہرو
تمھاری گلیوں میں چلنے والے کدھر گئے ہیں
گلاب چہرے،
کہ جن سے راتوں میں روشنی تھی کہاں چھپے ہیں!

گزرتی صدیوں نے جانے کیسی زباں میں اپنے الم لکھے ہیں،
شکستہ اینٹوں پہ درج کیا ہے
عبارتیں ہیں کہ زاویے ہیں،
مجھے یقیں ہے اُجاڑ شہرو
کہ اب سے پہلے بھی میرے پاؤں تمھاری مٹی کے جادؤں سے
گزر چکے ہیں
میں اپنے شہروں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں
زمانہ آئے گا جب یہ چہروں سے پُر دریچے
نظر میں کھبتی بہار گلیاں، نگار کوچے اُجاڑ ہوں گے،
رُکیں گی مٹی سے آبشاریں سمندر دوں ہیں پہاڑ ہوں گے،
مجھے یقیں ہے اُجاڑ شہرو
نئی پُرانی تمام چیزوں میں رابطے ہیں
کہ سب زمانے روایتوں کے تلازمے سے ملے ہوئے ہیں۔
گزرتے لمحوں کے سلسلوں سے کسے مفر تھا کسے مفر ہے۔

(۸)

گزرتے لمحو مجھے بتاؤ زمین کس کی تلاش میں ہے

ستارے کیا چیز ڈھونڈتے ہیں

وہ کیا تحیّر تھا جس میں اب تک پہاڑ گم سم کھڑے ہُوئے ہیں
سمندروں کا جمال کیا ہے کہ سرد چشمے تڑپ رہے ہیں
بدلتی رُت کا پیام کیا ہے کہ پیڑ الجھن میں پڑ گئے ہیں!
مجھے بتاؤ وہ رنگ کیا ہے جو میرے اندر ہے اور مجھ پر عیاں نہیں ہے
وہ کیا صدا ہے کہ جس کی کوئی زباں نہیں ہے!
وہ کون ہے جو کہیں نہیں پر کہاں نہیں ہے!
مرے قلم سے جو لفظ نکلے ہیں سب اُسی کے لکھے ہُوئے ہیں،
سوائے خواہش مری تمنّا کے سرد ہاتھوں میں کیا ہُنر ہے
میں اُس کو جھک کے سلام کرتا ہوں جو مجھی میں قیام کرتا ہے
اور مجھ سے عظیم تر ہے

۲۶
۱۲
۷۹

چشمِ بے خواب کو سامان بہت

چشمِ بے خواب کو سامان بہت!
رات بھر شہر کی گلیوں میں ہوا
ہاتھ میں سنگ لیے
خوف سے زرد مکانوں کے دھڑکتے دل پر
دستکیں دیتی چلی جاتی ہے،
روشنی بند کواڑوں سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہے،
ہر طرف چیخ سی چکراتی ہے،
ہیں مرے دل کے لیے درد کے عنوان بہت!

درد کا نام سماعت کے لیے راحتِ جاں،
دستِ بے مایہ کو زر
نطقِ خاموش کو لفظ

خوابِ بے در کو مکاں
درد کا نام مرے، شہرِ خواہش کا نشاں،
منزلِ ریگِ رواں
درد کی راہ پہ تسکین کے امکان بہت!

ہجر کا درد کٹھن ہے پھر بھی
وہ بھی اُس روز بچھڑ کر مجھ سے
خوش تو نہ تھی،
اُس نے یہ منزلِ غم
کس طرح کاٹی ہو گی،
وہ بھی تو میری طرح ہو گی پریشان بہت
(درد کی راہ میں تسکین کے سامان بہت!)

کیا خبر اس کی سماعت کے لیے
درد کا نام بھلا ہو کہ نہ ہو
شہرِ خواہش کا نشاں

نطقِ خاموش کا اظہار رہا ہو کہ نہ ہو

دستِ بے مایہ کا زر (وہ تہی دست نہ تھی)

ہجر کا درد بنا ہو کہ نہ ہو

اُس کی گلیوں میں رواں

دستکیں دیتی ہُوئی سرخ ہوا ہو کہ نہ ہو!

عشقِ نوخیز کے ارمان بہت،

شوقِ گُل رنگ کے رستے میں بیابان بہت،

سوختہ جان بہت،

چشمِ بے خواب کو سامان بہت،

ہوا میری رہبر

ہواؤں کی آہٹ پہ چلتے رہو
حقیقت مرے اور تمھارے خیالوں کی بے انت منزل
سے بھی کچھ بڑی ہے،
ہواؤں کی تحریر کس نے پڑھی ہے،
تم اچھی طرح جانتے ہو زمانہ
اِک اندھا مسافر ہے جو اجنبی شہر کی
تنگ، بے رنگ گلیوں میں لاٹھی گنوا کر پھسلتا سنبھلتا چلا جا رہا ہے
سمندر کی نیرنگیوں کی حقیقت پہاڑوں کے نوحوں کا اک سلسلہ ہے،
(سنا ہے کہ چیزوں کی تخلیق دراصل اک حادثہ ہے)
حادثوں کے مقدر کی کس کو خبر ہے؟
"مقدر" وہ اک لفظِ مبہم کہ جس کے "تحیر" میں ہمارے ہنُوڈوں کا مفر ہے
ہوا میری رہبر، ہوا میرا رستہ، ہوا ہم سفر ہے

تمھیں تو پتہ ہے ہواؤں کی زنجیر
ہم سب کے پاؤں میں، ہاتھوں میں، آنکھوں میں ہونٹوں میں
اور خواہشوں میں پڑی ہے۔
ہواؤں کے رستے سے جو بھی ہٹا ہے،
اُسے اجنبیت کا سم کھا گیا ہے،
(تمھی نے کہا تھا رفاقت کا صحرا بھی تنہائی کے شب کدے سے بھلا ہے)

تمنّا کے قصّے میں رکھا ہی کیا ہے!
بجز دردِ حاصل،
ہوا کے تغافل سے دل ہارتے ہو، مگر یہ بھی سوچو،
ہوا دل کا رستہ، ہوا دل کی منزل،
ہواؤں کی اُنگلی کو تھامے رہو، مسکراتے رہو،
ہواؤں کی تحریر کس نے پڑھی ہے!
ہواؤں کی آہٹ پہ چلتے رہو،

۲۰
۲
۷۰

اے ہجر زدہ شب

اے ہجر زدہ شب،

آ تو ہی میرے سینے سے لگ جا کہ بٹے غم،

احساس کو تنہائی کی منزل سے ملے رہ

آواز کی گمنام زمینوں کو ملے نم

آ کچھ تو گھٹے غم

اس ساعتِ مہجور کی فریاد ہو مدھم

کیوں نوحہ بلب پھرتی ہے محرومِ مخاطب!

اے ہجر زدہ شب!

دیکھ آج تمنّاؤں کی بے سمت ہوائیں

دل شرمندہ نظر کو،

پھر لے کے چلی ہیں وہی بے رخت ہوائیں

اسی جادو کے نگر کو،

جس خاک پہ اُترے تھے مُرادوں کے صحیفے
سنکی تھی جہاں سبز ہوا، کوئے وفا کی
مہکے تھے جہاں پھُول صفت رنگ کسی کے!
اُس خاک کا ہر روپ مرے واسطے زندان
کچھ رُوٹھے ہُوئے خواب ہیں،
کچھ ٹوٹے ہُوئے مان
کچھ برسے ہُوئے ابر ہیں، کچھ ترسے ہُوئے لب،
اے ہجر زدہ شب،

آ تو ہی گلے لگ کے بتا، کون یہاں ہے!
بجز خود سری موجِ ہوا، کون یہاں ہے!
ہمدرد مرا، تیرے سوا، کون یہاں ہے!
آ چُوم لوں آنکھیں تری، رخسار ترے، لب
اے ہجر زدہ شب۔

۲۰
۳
۷۰

ایمان کے محافظوں سے

میں خداوندِ برتر کی تخلیق ہوں،
جس نے پھولوں کو خوشبو، درختوں کو چھاؤں
سمندر کو پانی، ہواؤں کو چلنے کی طاقت عطا کی،
ستارے، زمیں، چاند، سورج، بنائے
میں کہتا ہوں سب آدمی، آدمی ہیں
نہیں کوئی بہتر کسی سے
سوا اُن کے جو متّقی ہیں،
میں کہتا ہوں اس خاک پر زندہ رہنے کا حق سب کو ہے،
سب کو حق ہے کہ محنت کی تخلیق سے اپنے دامن بھریں!
اس زمیں پر چلیں، آبرو سے رہیں، دل کی باتیں کہیں!
مسکرا بھی سکیں،
جس کی خواہش کریں اُس کو پا بھی سکیں،

میں کہتا ہوں سب ابنِ آدم ہیں تو
کیوں نہ سب کو برابر کی عزّت ملے
کیوں کوئی کج کلاہی کے نشّے میں ہو
کیوں کسی کو فقط مرگِ تہمت ملے'۔

میں اُن تیرہ بختوں، سیہ قسمتوں کے لیے روشنی مانگتا ہوں
جنھیں تم نے صدیوں تک اپنی غرض اور انا کی بقا کے لیے
پتّھروں کی طرح بے حقیقت گِنا ہے'۔
میں اُن کے لیے بولتا ہوں جنھیں
تم نے اپنی فصاحت کے طوقِ توہم میں جکڑا ہُوا ہے
جسے تم نے ہر دَور میں ظلم کے ہاتھ بیچا ہے، میرا خدا ہے

اختیار

کہا اُس نے، دیکھو،
تمنّا کے رستے بہت بے خبر ہیں
جو آگے گئے تھے سماعت کے جادُو میں کھوئے ہُوئے ہیں۔
اگرچہ تمھاری یہ خود اعتمادی
تمھیں اس مسافت میں تھکنے نہ دے گی
مگر یاد رکھو
سفر کے لیے صرف چلنا ضروری نہیں، اور دیکھو
ہوا آج تک بے ٹھکانہ ہے، لہریں
کناروں سے سر مار کر لوٹ جاتی ہیں، تارے
ازل سے خود اپنے گرفتار ہیں اور آنکھیں پرانے مناظر میں گم ہیں۔
تمنّا ہمارے لیے شہرِ افسوں ہے جس کی فصیلوں، دریچوں، دروں
میں خیالوں کی پریاں کھُلے گیسوؤں سے گزرتے ہُوئے رہرووں کو
اشاروں سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں خوں گرم جسموں میں
رُکتا ہے پاؤں اگر ٹھہر جائیں تو چلتے نہیں۔
بدن پتھّروں سے نکلتے نہیں۔

زندگی کا فسانہ بہت مختصر ہے
کہیں یہ نہ ہو اس کہانی کی تمہید ہی اس کا انجام ہو،
اور سنو جب تمنّا کے رستوں سے گزرو
تو آگے گئے قافلوں کی سبھی یادگاروں کی تعظیم کرنا
جہاں سے بھی گزرو نقوشِ کفِ پا کو محفوظ کرنا،
کہ لاکھوں یہاں بے نشاں پھر رہے ہیں
ہر اک راہ پر رفتگاں پھر رہے ہیں

سنو میری مانو
تمنّا کا حاصل فقط گمرہی ہے
چلو ہم زمانے کا دامن پکڑ کر
یہ عمرِ رواں کا سفر کاٹ ڈالیں
لب و گوش پر خامشی کو سجالیں،
دریچوں میں آباد چہرے نہ دیکھیں
جہاں ردشنی ہو نگاہیں بچالیں
رفاقت کے اس واہمے سے گزر لیں
ہمیشہ بھٹکنے سے بہتر ہے — آؤ
جو کل ہونے والا ہے وہ آج کر لیں

۱۹
۵
۷۰

سوال

آسمانوں سے کوئی بشارت نہیں اور زمیں گُنگ ہے
وقت اک بیوہ ماں کی طرح سوگ میں مبتلا ہے — ہوا
سسکیاں لے کے چلتی ہے کالی ہوا
خواہشوں کے کنول درد کی جھیل سے سر اُٹھاتے نہیں
خواب تک بند پلکوں میں آتے نہیں۔

ساری سچی کتابوں میں یہ درج ہے
ایسے حالات میں
آسماں سے نبی یا تباہی زمیں کی طرف
بھیجے جاتے رہے ہیں
مگر ان کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے،
نبی اب نہیں آئیں گے —!

۲۱/۶/۷۰

دُھوم ہے پھر بہار آنے کی

میں نے چاہا اُسے بھُول جاؤں
فراموش کر دوں وہ سب
روز و شب!
اُس کو دیکھوں تو یوں جیسے واقف نہیں
میں بھی اُس کی طرح اب کسی اور کو ساتھ لے کر چلوں
ہر گھڑی خوش رہوں، مسکراتا پھروں،
بے وجہ بے سبب!
جب ہوا کے قدم مثلِ مے نوش بے ڈھب سے پڑنے لگیں
چاندنی کھڑکیوں سے پکارے نگاہیں چمکنے لگیں
آہٹیں کان میں سبز سرگوشیاں کر کے چلنے لگیں
دستِ موسم کے اعجاز سے پیرہن — زرد پتّے بدلنے لگیں
بختِ خوابیدہ گُل آنکھ ملنے لگیں

کاش یوں ہو کہ تب
اُس کو دیکھوں تو وہ اجنبی سا لگے،
اُس کی آہٹ پہ خواہش کے گُل نہ کِھلیں
وہ پکارے اگر اُس کی آواز پر کان تک نہ دھروں،
عہدِ رفتہ کی ہر یاد کو بھول کہ آنے والی رُتوں کا سواگت کروں
اُس کے چہرے کو چہروں کے انبوہ میں اس طرح گم کروں،
پھر وہ آنکھیں رہیں نہ وہ گیسو نہ لب،
میں نے چاہا اُسے بھول جاؤں
فراموش کر دوں وہ سب،

۸/۷/۷۰

دشتِ طلب

درِ طلسمِ صدا کھلے تو اُسے پکاریں،
کہ اُس کے ہاتھوں میں خواہشوں کا قبول رد ہے،
اُسے دکھائیں کہ کتنے بادل
ہمارے کھیتوں سے بے تعلّق نکل گئے ہیں،
اُسے بتائیں کہ کتنی کلیاں
کشاد ہونے کی آرزو میں بکھر گئی ہیں۔
سنائیں اُس کو وہ لفظ جن کے
حروف بے صوت ہو گئے ہیں
رُلائیں اُس کو اُن آنسوؤں پر
جو خشک آنکھوں میں کھو گئے ہیں
گلو گرفتہ اُداس لمحے، اُجاڑ صورت بکھرتے موسم
وہ بختِ گریاں جو سو گئے ہیں۔

درِ طلسم صدا کھُلا تو عجب ہے منظر
چہار جانب ہجومِ خلقت ہے مثلِ لشکر
اُسی کی جانب رواں دواں ہیں
برہنہ پا و شکستہ رنگ و غبار بر سر
سفید سائے، سیاہ پیکر
لبوں پہ خواہش کے سبز جنگل، نظر سمندر
صدائیں اتنی ہیں ماند پڑتا ہے، شورِ محشر،
اُسے سنائیں تو کیا سنائیں
کہ اپنی اپنی زباں میں سارے ہمارا قصّہ سنا رہے ہیں،
وہ جس کے ہاتھوں میں خواہشوں کا قبول رد تھا
ہر اک کی آواز سُن رہا ہے،
درِ طلسمِ صدا کھُلا ہے،
کسے پکاریں —؟

۴/۸/۷۰

سپردگی

اے متاعِ نظر،

میرا ہونا تری ذات سے اس طرح منسلک ہے

کہ جیسے کسی سیپ کی آبرو اُس کے گوہر سے ہے

جیسے پرچھائیں کا ربط پیکر سے ہے

جس طرح رنگِ مے جام و ساغر سے ہے

میں اگر بولتا ہوں تو تیرے سخن کی عنایت ہے یہ

میں اگر دیکھتا ہوں تو تیری نگہ کی کرامت ہے یہ

میں اگر چپ ہوں تیری محبّت ہے یہ

میں سمندر نہیں

جو کناروں سے نکلوں تو آبادیوں میں قیامت مچے

میں مقدّر نہیں

جو بدلتا رہوں، بن کہے، بن سُنے،

میں نہیں تشنہ لب جو سرابوں کی آہٹ پہ چلتا رہوں

میں بگولہ نہیں جو ہوا کے اشارے پہ اُڑتا پھروں

میں ترے شہر کے سنگدل راستوں کا ستایا ہُوا
اک مسافر ہوں جس کی گرہ میں فقط آرزو ہے
نگاہوں میں تُو ہے،
میں ترے جاں نثاروں کے انبوہ سے ہوں۔ ترے واسطے ہوں
تو مجھے جانتا بھی نہ ہو تو تعجب نہیں
ہاں ترے واسطے تو مرے ساتھ کے، سینکڑوں ہیں یہاں
خاک بر سر، پریشاں نظر، بے نشاں،
ناشناسی کی قاتل ہوا سے بچیں کس طرح اور جائیں کہاں؟
اے تمنّائے جاں،
اجنبیّت کے اس شہرِ گمنام میں، میں ترے نام کا ایک مصلُوب ہوں،
واپسی کے لیے کوئی رستہ نہیں — تو بھی ملتا نہیں
ہوں مبارک تجھے تیری کم گوئیاں — تجھ کو ڈھونڈوں کہاں؟
میرے احساسِ جاں کی نمو تجھ سے ہے،
میں اگر سیپ ہوں آبرو تجھ سے ہے
پھُول ہوں میں، اگر رنگ و بو تجھ سے ہے
اور اگر جسم ہوں تو لہو تجھ سے ہے

۱۰ / ۹ / ۷۰

آخری خواب

مقدّروں کی سیہ عبارت کے لفظ قاہر ہیں اور ہم سب
کسی کی لکھی ہوئی کہانی میں اپنے کردار ڈھونڈتے ہیں۔
ہمارے خوابوں کی بے کرانی، تلاشِ معنی
کی سبز خواہش کے ایک نقطے سے پھوٹتی ہے
پکار بیتے ہوئے دنوں کی اور آنے والی رُتوں کی آہٹ
ہر ایک منظر میں گونجتی ہے

کوئی تو ہوگا
جو میری بے خواب سرخ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے
لرزتے ہونٹوں سے یہ کہے گا،
"بہت ہی اچھا تھا جانے والا"

۱۴
۱۰
۷۰

بے کسوں میں سرکشی کا حوصلہ آنے کو ہے

دوستو اُٹھو کہ وقتِ امتحانِ جسم و جاں ہے
وہ گھڑی سر پر کھڑی ہے
جو تمھاری اور میری آرزوؤں سے بڑی ہے۔
خواب کا لمحہ شکستِ خواب سے زیادہ گراں ہے،
بزدلی کی زیست مرگِ رائیگاں ہے،
خواہشوں کی بند گلیوں میں ہوا آنے کو ہے
اَن گِنت گونگی زبانوں میں نوا آنے کو ہے
آنسوؤں سے کور آنکھوں میں ضیا آنے کو ہے
ظلم کی میعاد آخر ہو گئی ہے
بے کسوں میں سرکشی کا حوصلہ آنے کو ہے
دوستو آگے بڑھو

خوشبوؤں، رنگوں، ہواؤں، موسموں کی راہ میں
خواب کے قریے میں پھیلی بستیوں کی راہ میں
منزلوں کی دھن میں بڑھتے قافلوں کی راہ میں
جو بھی آتا ہے اُسے دشمن کہو۔

ہو رہی ہے ایشیا میں ظلم کے سورج کی شام
اپنے خوں کے ایک اک قطرے کا لینا انتقام
جتنے ساتھی اس کشاکش میں مرے ہیں (یا مریں گے)
اُن کی روحوں کو سلام۔

۱۶
۱۰
۷۰

فریبِ تماشا

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے،

وہ مجھ سے ہے بالکل ایسے، جیسے پھولوں سے خوشبو ہے

یا پھر میں اُس سے ہوں جیسے آنکھوں سے آنسو ہے،

شاید ہم دونوں کا ہونا ان سب چیزوں کا ہونا ہے

یہ سب چیزیں،

جن کے لیے جب تک ہم زندہ ہیں، ہم کو رونا ہے،

وقت اک بگڑے بچے ساضدی ہے، جس کے آگے

ہم دونوں کا ہونا ایک کھلونا ہے۔

جب وہ چلتا ہے تو میرے من میں آہٹ سی ہوتی ہے

جیسے وہ اک رہبر ہے،

میں چلتا ہوں تو وہ میرے آگے پیچھے یوں چلتا ہے

جیسے میری راہ گزر ہے

راہگزر، جو خوابوں کی گمنام زمینوں کو جاتی ہے،

جیسے آپ مسافر ہے!

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے!
یہ جو ہمارے ہاتھ ہیں ان سے بہتے دریا رُک سکتے ہیں،
پاؤں میں اتنی طاقت ہے
ہم دشتِ فنا میں چل سکتے ہیں
آنکھوں میں منظر ہیں ایسے جن کو ابھی بننا ہے
اور رستے ہیں جن پہ ابھی چلنا ہے
اور جنگل ہیں جن میں دشمن مخلوقوں سے لڑنا ہے،
اور کلیاں ہیں جن کو ابھی کھلنا ہے،

سینے میں خواہش ہے،
خواہش ایسا اسمِ اعظم ہے جو سب بھیدوں کی کنجی ہے،
جو ہونے کو انہونا، موتی کو کنکر، صدیوں کو لمحہ اور لمحے کو
صدیوں جیسا کر سکتا ہے،

ہونٹوں میں وہ جادو ہے
جو پتھّر میں پھول اُگا سکتا ہے تارے توڑ کے لا سکتا ہے،
جو پیارے ہم سے بچھڑ گئے ہیں اُن کو واپس لا سکتا ہے
جن کو ابھی آنا ہے اُن کے سندر رنگ دکھا سکتا ہے۔

جتنا کچھ میں جانتا ہوں اور جس کا مجھ کو علم نہیں، اور وہ جو مجھ سے ہے
یا میری آنکھوں سے اوجھل ہے،
اور وہ جو مجھ سے پہلے تھا اور وہ جو مستقبل ہے،
لفظ ہی ان سب رازوں کا سینہ ہے،
جتنا کچھ میں کرتا ہوں یا کرتا تھا یا کرنے والا ہوں
لفظ اس کا تخمینہ ہے،
روشنی خود سورج ہے یا سورج کا حصّہ ہے (بہت پرانا قصّہ ہے)
آؤ کالی رات کے دامن سے لپٹیں اور سو جائیں،
یہی ہمارا جینا ہے!

تیز ہوا کا پہلا جھونکا
اپنے پیچھے، پیلے پتّوں کی لاشوں کے ڈھیر لگاتا گزرا ہے
موسمِ گُل کا پہلا نغمہ
چاروں جانب پھُول کھِلاتا گزرا ہے
پہلا بادل سرد دلوں میں آگ لگاتا گزرا ہے
لیکن میں اور وہ جو میرا جسم ہے اور جس کا میں سایہ ہوں یا، ...!

بے ہنری کے بنجر ماہ و سال کے دھندلے آئنوں میں وہ تعبیریں ڈھونڈ رہے ہیں
اب تک جن کے خواب ہماری آنکھوں سے بے گانہ ہیں،
اُن شہروں کی یاد میں گم ہیں ازل سے جو ویرانہ ہیں۔
کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے،

یہ جو ہمارے ہاتھ ہیں ان کو ہم بس مل سکتے ہیں

لاحاصل کا غم ہی ان کی دولت ہے
دشتِ فنا کو دیکھیں تو اُلٹے پھر جائیں۔ پاؤں میں اتنی طاقت ہے
آنکھوں میں جالے سے تنتے ہیں گرد آلود خیالوں کے، اور رونے کی فرصت ہے
خواہش کی اوقات شکستِ خواب کا زخمِ تازہ ہے،
بے ترتیبی ہستی ہے اور تارِ فنا شیرازہ ہے،
لفظِ سمندر کی دہشت ہے ساحل کا خمیازہ ہے،
شاید ہم دونوں کے سائے اُن سب چیزوں کے سوتے ہیں،
جن کے لیے ہم جیتے ہیں اور جن کے لیے ہم روتے ہیں۔

۲۲
۱۱
۷۰

ایک تباہ شدہ جہاز کی کہانی

باش اے اہلِ سفر،
موج در موج بپھرتے ہوئے پانی نے کہا
ساحلوں پر جو ضمانت تھی نکل چلنے کی
اب وہی رونقِ سیلاب بنی ہے — دیکھو
رزقِ گرداب بنی ہے — دیکھو
وہ جو گھر چھوڑ کے نکلے تھے نئے رستوں پر
ڈھونڈنے اپنی اُمیدوں کی زمیں

اب کھڑے سوچتے ہیں،
کس طرف جائیں، کسے پوچھیں، کہاں پر ڈھونڈیں
وہ مسافت کی امیں،
صورتِ وہم ہے ہر شکلِ یقیں،
دامِ ہر موج میں منظر ہے نیا، خوفِ بے نام کے جادو سے رہا
ایک بھی آنکھ نہیں

کفِ سیلابِ بلا، کفِ لبِ ہائے دعاگو کی طرح
دمبدم بڑھتا چلا جاتا ہے
آسمانوں کی طرف دیکھ کے سب روتے ہیں
تو کہ ہر ایک کی سُنتا ہے کہاں ہے؟ — تو کہیں ہے کہ نہیں!!

"تم مجھے چھوڑ کے جاتے ہو کہاں — رُک جاؤ!
میں تمنّا ہوں مرا حرفِ مقدّر تم ہو!
جوئے کم آب ہوں میں اور سمندر تم ہو!
ہاں مری جان! مری جاں کے مسافر تم ہو!
آؤ بستی کی طرف جائیں وہاں پر ڈھونڈیں
کوئی چھت جس کے لیے
ہم تمنّا کے در و بام کی تعمیر کریں
اے سمندر کی ہوا روک اسے — رک اے مسافر جاں کے،
اے ہوا روک اسے — روک اسے روک ..."

"ہائے وہ لوگ تو مر جائیں گے

جو مری آس پہ جیتے ہیں جنھیں
اُس سمے میں نے کہا تھا دیکھو — مجھ کو ہنستے ہوئے رخصت کرنا
اے مری آنکھ کے تارو، مرے پیارے بچّو!
یہ بلا خیز ہوا کالی مسافت کے عذاب
مجھ کو سہنا ہیں جہاں سبز ہنسی ملتی ہے،
وہ طرب خیز ہنسی
میں جسے ڈھونڈنے نکلا ہوں تمھاری خاطر — !
اے مری جانِ سفر، اتنی مایوس نہ ہو
دیکھ نہ رو،

میں بہت جلد چلا آؤں گا
ہاں مری جان بہت جلد چلا آؤں گا
بھر کے دامن میں تمھاری خوشیاں،
میری پیاری — خوشیاں
(ہائے افسوس ہماری خوشیاں)

•

وہ کیسا بھرپور جواں تھا وہ شخص
اپنے ہی خون میں تر وہ مرے پاس گرا تھا لیکن

اتنی بے رنگ تھیں آنکھیں اُس کی
جیسے وہ خواب میں ہو،
نہ کہیں خوف کا سایہ تھا نہ نفرت کا نشاں
زندہ رہنے کی تمنّا تھی نہ مرنے کا گماں،
جیسے وہ مست مئے ناب میں ہو،

اُس نے ہولے سے کہا،
یہ مجھے کون سمندر میں اُٹھا لایا ہے؟
کیسا سیلاب مری سمت بڑھا آتا ہے
پانی...... پانی
کیا خبر موت سمندر کی طرح ہوتی ہو؟

زندگی بھر کی کشاکش کا صلہ
سنگِ مرمر سے بنائی ہوئی اُلجھی کوٹھی
فیکٹری — کار — زمیں — داشتہ، جنسی امراض
کتنے خوش ہوں گے مری موت پہ سارے بچّے!
میرے سنگ زادے، مرا خون، میرے پیارے بچّے!

کاش یہ چانس مجھے مل جائے
سب کو میں عاق کروں، کام کروں نیکی کے
نام کر جاؤں کوئی فیض کے اسباب کروں،
جی میں ٹھانی ہے کہ بچ جاؤں تو مکّے کو چلوں

....

کوئی آواز نہیں
آسمان اور سمندر کی کڑی دہشت سے
بے خبر
ایک ٹوٹے ہوئے تختے پہ بہا جاتا ہے
ایک ننھا سا بشر
ساحلوں پر اسے کچھ لوگ ملیں گے پھر یہ
آپ اک روز سمندر کی طرف آئے گا
کون سے روپ ہیں، کب آئے
نہیں اس کو خبر
روزِ اوّل سے رواں — ابنِ آدم کا سفر۔

۲۷
۱
۷۱

جاگتی آنکھیں

چہروں سے بازار بھرے ہیں — آوازوں سے گھر
پھر بھی خون میں تیر رہا ہے — اک انجانا ڈر
خاموشی کے بام ہزاروں — چپ کے لاکھوں در
خواہش ایک تاریک مسافت — پتھّر ہی پتھّر

منظر کے آشوب سے نکلو سپنوں میں کھو جاؤ
اے شہرِ بیدار کے لوگو، تم بھی اب سو جاؤ

12/2/71

خواہشوں کی خاک پر

خواہشوں کی خاک پر قریہ بہ قریہ، کُو بہ کُو
اپنے ہی نقشِ قدم ہیں روبرو
جب بھی دیکھا بے نمو
خوابوں کے بننے ٹوٹنے کے درمیاں
آنکھ میں بکھرا ملا ہے ایک دشتِ رائیگاں،
بے ثمر ہر جستجو!
جو لکھا سو لوحِ قسمت کی طرح
اپنے ماتھوں پر لیے چلنا پڑا
راستے میں جسم و جاں کی آگ کا دریا بھی تھا
سنگدل حرفوں کی ٹھنڈی آنچ میں جلنا پڑا،
ہیں صدف پر ریت ہے اپنے گُہر کی آبرُو!

ان کہے لفظوں کی قاتل فوج میں
سب کے ہونٹوں پر ہنسی ہے سب کی آنکھوں میں حیا
"آستیں میں دشنۂ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھُلا"
دشتِ جاں میں یوں رواں ہے دشمنوں کا قافلہ

جیسے دریا موج میں
آئینے ہیں آئنوں سے دو بدو
کس کے ہاتھوں پر گرا اپنا لہو!
ہم زمستاں کے مسافر ہیں ہمہ تن برف ہیں
منجمد قطرے کی صورت بادلوں کا ظرف ہیں
جو لبوں پر ہی ٹھٹھر کر رہ گئے وہ حرف ہیں
ہم ہوا کا صرف ہیں
مثلِ غبارِ آرزو!!
بھید اپنا کون جانے گا، دریچے بند ہیں،
سرد مہری کے قفس ہیں
سب کے چہرے بند ہیں،
کس طرف جائیں کہ رستے بند ہیں۔
صوتِ گنبد کی طرح چکرا رہے ہیں چار سُو
آپ اپنی قید میں ہیں، کون ساتھی۔ اکیا عدو!
خواہشوں کی خاک پر قریہ بہ قریہ، کُو بہ کُو
اپنے ہی نقشِ قدم ہیں روبرو

ایک لڑکی

گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
وہ جب بھی کالج کی سیڑھیوں سے
سہیلیوں کو لیے اُترتی
تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اُتر رہی ہو،
کچھ اس تیقّن سے بات کرتی تھی جیسے دنیا،
اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہو،
وہ اپنے رستے میں دل بچھاتی ہوئی نگاہوں سے ہنس کے کہتی،
"تمھارے جیسے بہت سے لڑکوں سے میں یہ باتیں
بہت سے برسوں سے سن رہی ہوں
میں ساحلوں کی ہوا ہوں نیلے سمندروں کے لیے بنی ہوں۔

وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی

جو راہ چلتی تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اُتر رہی ہو،

وہ کل ملی تو اسی طرح تھی۔

چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے، گلاب چہرے پہ مسکراہٹ

کہ جیسے چاندی پگھل رہی ہو،

مگر جو بولی تو اُس کے لہجے میں وہ تھکن تھی

کہ جیسے صدیوں سے دشتِ ظلمت میں چل رہی ہو۔

دل اک خواب نگر ہے

دل اک خواب نگر ہے جس میں لمحہ لمحہ
اُس کے سپنے، بند آنکھوں میں نئے دریچے وا کرتے ہیں۔
ہر چہرے میں اُس کا چہرہ رکھ دیتے ہیں۔
میرے اُس کے بیچ ہزاروں دیواریں ہیں
رسموں اور رواجوں کی
بیگانوں کی قاتل نظروں اور اپنوں کی باتوں کی
اُس کی بے پروائی کی اور اپنی پاگل سوچوں کی
کالی، دشمن راہوں کی۔

میں اس ظالم، اندھی اور منہ زور فضا میں اک بے مایہ ذرہ تھا
جو اپنے سے لاکھوں میں گم تھا
اُس کے خواب نے میری آنکھیں روشن کی ہیں
خاموشی میں جادو ہے تو پھر وہ جادوگر ہے!
اُس کی چُپ نے میرے دل کو نطق دیا ہے“

میں قطرہ تھا اُس کی ذات سمندر ہے!
اُس کی محبت نے مجھ کو تخلیق کیا ہے،

ارمانوں کی بانجھ ہوائیں
آنکھوں کے گمنام جزیروں میں چلتی ہیں
اور خواہش کے خشک درختوں کی شاخوں میں
سائیں سائیں کرتی ہیں
موسم آنکھیں پھیر کے دل کے درد نگر سے چل دیتے ہیں
بادل ویرانے پہ گھر کر بن برسے چل دیتے ہیں
اُس کے بنا آواز کی کرنیں۔ آنکھیں۔ پھول، ستارے، پتھر
دل اک شہرِ سنگ ہے جس میں گلیاں، باغ، منارے، پتھر
خواہش جادو کی بستی ہے، مڑ کے دیکھو، سارے پتھر
دریاؤں کے دھارے پتھر!
وہ آئے تو پتھر کو آواز ملے
شہرِ سنگ کے دروازوں کو وا کرنے کا راز ملے
دل اک خواب نگر ہے اِس کے، خوابوں کو آغاز ملے۔

اے وطن کی ہوا

اے وطن کی ہوا
ہم ابھی ننھّے منّے سے معصوم بچّے تھے جب ایک دن
تو انہی آنگنوں، روزنوں، چلمنوں، وادیوں، پربتوں،
بستیوں اور جزیروں کی تقدیریں
روشنی کے پھریرے اُڑاتی ہُوئی آئی تھی اور ہم
جن کے کانوں نے ماں کی سبک لوریوں کے سوا کچھ سنا ہی نہ تھا،
جوش انگیز نعروں کی آواز پر مسکرانے لگے تھے
کہ اس میں سماعت کو راحت ملی تھی، وہی نغمگی
بچپنے سے جوانی کے ہر موڑ تک مثلِ موجِ نفس
ساتھ چلتی رہی۔

اے وطن کی ہوا
تیری خوشبو ہمیں سحر کی مثل ہے جس میں ہم بند ہیں
ہم جہاں بھی رہیں تیرے پابند ہیں

ہم میں کتنے ہیں جو تیری خوشبو کی میٹھی مدھر تان پہ
اپنا سب کچھ گنوا کر تری سمت بازو کشادہ چلے
اور کتنے ہیں جو تیرا رستہ بتانے کی پاداش میں ظلم سہتے رہے،
اور کتنے ہیں جو آنکھ کھُلنے سے اب تک تجھی میں پلے،
پر سبھی ایک دوجے کے مانند ہیں۔

اے وطن کی ہوا
تیری رفتار کے سینکڑوں رنگ ہیں،
ہم نے دیکھا تجھے،
سرفروشوں کے پہلو میں لڑتے ہوُے
سرحدوں کی طرف آگے بڑھتے ہوُے
شہر و دیہات کے ہر در و بام پہ جگمگاتے ہوُے،
دُشمنوں کی طرف سنسناتے ہوُے،

ہم نے دیکھا تجھے
خوف و دہشت سے پُر سرد تاریک سڑکوں پہ چلتے ہوُے
بے خطر گرم آنکھوں میں پلتے ہوُے

ہم نے دیکھا تجھے
اشک آور کسیلے دھوئیں میں لپٹ کر چمکتی نگاہوں سے بہتے ہوئے
قصّۂ خونِ مظلوم کہتے ہوئے

ہم نے دیکھا تجھے
شہر در شہر زندانیوں کے لیے بَین کرتے ہوئے
قصرِ سلطان کے آہنی گیٹ سے سر پٹکتے ہوئے
اے وطن کی ہوا
تیری رفتار کے سینکڑوں رنگ ہیں
ہم مگر دنگ ہیں،
کہ ترا راستہ تو وفا کے گلستاں، اخوّت کی گلیوں،
یقیں اور محبّت کی گلپوش راہوں، چمکتی پناہوں
کی جانب چلا تھا مگر تو ہمیں کون سی
وادیٔ خار میں لے کے پھرتی رہی،
شیشۂ چشم پر ہر طرف زنگ ہیں،
ہم تجھے اپنے بے سمت، کالے سفر کی کتھا کیا سنائیں،
تجھے سب خبر ہے تجھے کیا بتائیں،

روزِ آغاز سے ہم ترے سنگ ہیں
منزلِ بے جہت کا الم ہے وہی
اور غم کے وہی زرد فرسنگ ہیں

اے وطن کی ہوا

آج کا دن ترا روزِ آغاز ہے،
اے ہماری مسافت کے آغاز و انجام سے آشنا
منزلوں کی جبینوں سے پردہ اُٹھا
لوریوں اور نعروں کی تفریق سے بے خبر جب ابھی ننھے مُنّے سے
معصوم بچّے تھے ہم
اُس زمانے کی خوشبو کا نغمہ سنا،
پھر وہ ماں سا مقدّس، محبّت بھرا نرم چہرہ دکھا
اے وطن کی ہوا۔ اے وطن کی ہوا

چھ ستمبر

چھ برس پہلے اسی روز انہی گلیوں میں
خون کا رنگ لیے
موسم جنگ لیے
سنسناتی ہوئی بے چین ہوا آئی تھی،
چھ برس پہلے اسی روز انہی کانوں میں،
سرفروشوں کے ارادے لے کر
قریۂ سبز کے جادے لے کر
جرأت و عزم کے نغموں کی صدا آئی تھی،
چھ برس پہلے اسی روز انہی آنکھوں میں
خوابِ دہشت کی فصیلیں ٹوٹیں
سینکڑوں رنگ شعاعیں پھوٹیں

اور بے برگ درختوں میں صبا آئی تھی،
چھ برس پہلے اسی روز انہی کھیتوں میں
جلتے سورج کی تمازت کا مداوا کرنے
خاکِ بے آب کو تازہ کرنے
شوقِ اظہار لیے سبز گھٹا آئی تھی،

چھ برس پہلے اسی روز مرے چار طرف، ایک ریوڑ کی طرح
چلتی ہوئی بھیڑ کی اور بے نام سرابوں میں گھری آنکھ کو بینائی ملی،
دل کے دریائے تنک آب میں اک موج اُٹھی،
میرے اطراف میں پھیلی ہوئی خالی آنکھیں، بے ہنر ہاتھ، لبِ خشک
گریزاں پاؤں
اور کندھوں کے شکنجوں میں لٹکتے بازو،
بے اماں تیز ہواؤں کی نوائیں سن کر پیکرِ آدمِ خاکی میں ڈھلے
قافلے دل کے چلے،

چھ برس بعد وہی دن ہے وہی شہر ہے گلیاں ہیں وہی،
گلشنِ خوف وہی درد کی کلیاں ہیں وہی

ہیں ہواؤں کی گزرگاہ میں آنکھیں میچے
اپنی پہچان بھلائے ہُوئے لوگوں کا سفر دیکھتا ہوں،
اپنے اطراف میں ریوڑ کی طرح
بے خبر بھیڑ کے قدموں کی دھمک سُنتا ہُوں،
بے ہُنر ہاتھ، لبِ خشک، گریزاں پاؤں
اور کندھوں کے شکنجوں میں لٹکتے بازو
مجھ سے کہتے ہیں اُٹھو،
شہر در شہر چراغاں کرکے فتح کا جشن کریں
جنگ کی سال گرہ کا دن ہے آؤ ہم رقص کریں ۔

چھ برس پہلے اسی روز انہی گلیوں میں
خون کا رنگ لیے
موسمِ جنگ لیے
سنسناتی ہُوئی بے چین ہوا آئی تھی

۲۳
۸
۷۱

اِعلان

تمام دنیا میں جتنے ظالم جہاں جہاں ہیں اُنھیں بتا دو،
کہ نسلِ آدم کی جتنی ذلّت تھی اُن کے بس میں وہ کر چکے ہیں
جو اُن کی پلکوں کی جنبشوں میں حیات پاتے تھے مر چکے ہیں؛

یہی اُفق تھے کہ جن میں صدیوں سے کوئی سورج
نہیں اُگا تھا
یہی زمینیں تھیں جن کا جوبن
پرائے لوگوں میں بٹ رہا تھا
یہی وہ گمنام دلہنیں تھیں کہ جن کے ماتھوں
پہ کوئی جھومر نہیں سجا تھا،
اُنھیں بتا دو اُداس نسلوں کے خواب رستے نکھر چکے ہیں۔

سیاہیوں کے عقب سے پھوٹی ہے روشنی کی اُمید آخر،
قفس نشینوں کو مل رہی ہے رہائیوں کی نوید آخر،
گلاب جسموں سے ہونے والی ہے اب ہوس کی کشید آخر،
اُنھیں بتا دو کہ تشنہ کاموں کے صبر پیمانے بھر چکے ہیں۔

جو اپنے ہونے سے منفعل تھے
سروں کو تانے ہوئے کھڑے ہیں
نواحِ ظلمت میں قریہ قریہ
نئی سحر کے عَلَم گڑے ہیں،
غبار آسا جو منتشر تھے
مثالِ کوہِ گراں اڑے ہیں،
اُنھیں بتا دو کھُلے فلک سے غلام سورج گزر چکے ہیں!
تمام دنیا میں جتنے ظالم جہاں جہاں ہیں اُنھیں بتا دو
جو اُن کی پلکوں کی جنبشوں میں حیات پاتے تھے مر چکے ہیں۔

۱۳
۹
۷۱

وطن کی مٹّی پکارتی ہے

ہوائے سرحد ہمارے شہروں کی سمت آئی تو اُس کے ہونٹوں پہ یہ نوا تھی،-

"مجاہدوں کو نوید پہنچے
کہ آزمائش کی جس گھڑی کے وہ منتظر تھے - وہ آگئی ہے
صدا وطن کی ہر ایک سرحد پہ گونجتی ہے
اُٹھو کہ تم کو وطن کی مٹّی پکارتی ہے!"

ہر ایک لب پر یہی صدا تھی،

وطن بُلائے تو سوچنے کا مقام کیا ہے؟
چلو کہ سرحد پہ اپنے خوں سے لکھیں شجاعت کی داستانیں،
چلو کہ فانی کو غیر فانی میں ڈھالنے کا کمال جانیں

ہمیں وطن کی گلاب مٹّی کا ایک ذرّہ تمام دنیا کے مال و زر سے عزیز تر ہے!
اس ایک ذرّے میں آٹھ صدیوں کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں، یہ داستانیں
ہمارے خوں کے ہر ایک قطرے میں موجزن ہیں۔

اُٹھو کہ ماضی کی داستانوں کو اپنے تازہ لہو سے سینچیں،
کہ آنے والے دنوں کی فصلوں کے بیج بونے کا وقت آیا،
جو آج بوئیں گے کل اُسی کو ہی کاٹنا ہے
کہ جو بھی لمحہ گزر رہا ہے
وہ آگے گزرے چراغ لمحوں اور آنے والے فراغ لمحوں میں رابطہ ہے!

پکارتے ہیں دروں، دریچوں سے آبرو کے بہار موسم
گلاب بونے کی رُت نہیں ہے کہ ہم کو اپنے
گھروں میں کھلتے گلاب بچوں کو پالنا ہے
کہ ماؤں بہنوں کے پھول چہروں اور اپنی معصوم بیٹیوں کے
لبوں پہ کھلتے ہوئے شگوفوں کو سرحدوں کی طرف سے بڑھتی سیہ ہواؤں
کے تیز حملوں کی زد میں آنے سے روکنا ہے۔
سروں کو ہاتھوں میں لے کے نکلو
کہ آنے والے دنوں میں عزت اور آبرو کا نشاں یہی ہے
وطن کی مٹی ہماری ماں کا سفید آنچل ہے
جس کی حرمت ہماری ہستی سے معتبر ہے

وطن کے رستے میں جو سپر ہو وہ سینہ ہم کو عزیز تر ہے
جہاں پہ منزل ہے آبرو کی وہیں ہماری بھی رہ گزر ہے
خُمِ شہادت میں آبِ حیواں چھلک رہا ہے،

ہمیں خبر ہے!

پکارتی ہے زمینِ سرحد،
"عظیم ہے گو وفا کی منزل، عظیم تر ہیں وہ پاؤں جن کو
صدا وطن کی ہمارے دامن میں لے کے آئی،
عظیم تر ہے وہ سبز خواہش
جو شوقِ رشتوں کی استواری کی سُرخ مٹی سے پھوٹتی ہے۔
عظیم تر ہے وہ سانس جس کی عزیز ڈوری
وطن کے رستے میں ٹوٹتی ہے۔"

۶۰
۱۲
۷۱

شکستِ انا

آج کی رات بہت سرد بہت کالی ہے
تیرگی ایسے لپٹتی ہے ہوائے غم سے
اپنے بچھڑے ہُوئے ساجن سے ملی ہے جیسے
مشعلِ خواب کچھ اس طور بجھی ہے جیسے
درد نے جاگتی آنکھوں کی چمک کھالی ہے،
شوق کا نام نہ خواہش کا نشاں ہے کوئی
برف کی سل نے مرے دل کی جگہ پالی ہے

اب دھندلکے بھی نہیں زینتِ چشمِ بے خواب
آس کا روپ محل، دستِ تہی ہے جیسے!
بحرِ امکان پہ کائی سی جمی ہے جیسے!
ایسے لگتا ہے کہ جیسے مرا معمورۂ جاں،
کسی سیلاب زدہ گھر کی زبوں حالی ہے۔

نہ کوئی دوست نہ تارا کہ جسے بتلاؤں!
اس طرح ٹوٹ کے بکھرا ہے انا کا شیشہ
میرا پندار مرے دل کے لیے گالی ہے،
نبض تاروں کی طرح ڈوب رہی ہے جیسے!
غم کی پہنائی سمندر سے بڑی ہے جیسے!
آنکھ صحراؤں کے دامن کی طرح خالی ہے،
وحشتِ جاں کی طرف دیکھ کے یوں لگتا ہے،
موت اس طرح کے جینے سے بھلی ہے جیسے!
تیرگی چھٹنے لگی، وقت رُکے گا کیوں کر،
صبح خورشید لیے در پہ کھڑی ہے جیسے،
داغِ رسوائی چھپانے سے نہیں چھپ سکتا
یہ تو یوں ہے کہ جبیں بول رہی ہے جیسے!

فریب خوردہ نسل کا عہد نامہ

ہم گنہگار ہیں،
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں،
ہم نے نظموں میں تیرے چمکتے ہوئے بام و در کے جہاں تاب قصّے لکھے،
پھول چہروں پہ شبنم سی غزلیں کہیں، خواب آنکھوں کے خوشبو قصیدے لکھے،
تیرے کھیتوں کی فصلوں کو سونا گنا، تیری گلیوں میں دل کے جریدے لکھے،
جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہم نے تیری جبیں پر وہ لمحے لکھے،
جو تصوّر کے لشکر میں لڑتے رہے
ہم وہ سالار ہیں،
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں۔
جاگتی آنکھ سے خواب دیکھے انھیں اپنی مرضی کی تعبیر دیتے رہے
ہم ترے بارور موسموں کے لیے بادِ صرصر میں تاثیر دیتے رہے

ہم اندھیرے مناظر کو روشن دنوں کی اُمیدوں سے تنویر دیتے رہے
تیرے ساحل کی آزادیوں کے لیے ہم تلاطم کو زنجیر دیتے رہے
جو ہمیشہ تجھے آرزو کے جھروکے سے تکتے رہے
ہم وہ فن کار ہیں۔
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں۔
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں ہم ترے دکھ سمندر سے غافل رہے
تیرے چہرے کی رونق دھواں ہو گئی ہم رہینِ حدیثِ غمِ دل رہے
ظلم کے روبرو لب کشائی نہ کی اس طرح ظالموں میں بھی شامل رہے
حشر آور دنوں میں جو سوئے رہے،
ہم وہ بیدار ہیں۔
اے زمینِ وطن ہم گنہگار ہیں۔
جب ترے زرد پڑتے ہوئے موسموں کو مہکتی شفق کی ضرورت پڑی
ہم نے اپنا لہو آزمایا نہیں
تیری خوشبوؤں کی تمنّا لیے آندھیوں کے جلو میں بھٹکتی رہی
ہم نے روکا نہیں
تیری مٹی نگاہوں میں بادل لیے خشک موسم کے رستے میں بیٹھی رہی

ہم نے دل کو سمندر بنایا نہیں،
تیری عزّت زمانے کے بازار میں دل جلاتی ہُوئی بولیوں پہ بکی
ہم نے کانوں میں سیسہ اُتارا نہیں

ہم گنہگار ہیں۔
اے زمینِ وطن تجھ کو تو علم ہے لوگ کیوں گردِ راہِ ملامت ہُوئے
جن محافظ نما دشمنوں کے عَلم تیرے روشن لہو کی شہادت ہُوئے
ہم بھی اُن کی سیاست کے نخچیر ہیں آستینوں کے جو سانپ ثابت ہُوئے
ہم بھی تیری طرح سازشوں کی ہوا
کے گرفتار ہیں۔
ہم گنہگار ہیں —
ہم گنہگار ہیں اے زمینِ وطن پر قسم ہے ہمیں اپنے اجداد کی
سرحدوں سے بُلاتے ہُوئے خون کی، اپنی بہنوں کی حرمت کی، اولاد کی
ہاں قسم ہے ہمیں آنے والے دنوں کی اور آنکھوں میں ٹھہری ہُوئی یاد کی
اب محافظ نما دشمنوں کے عَلم
اُن کے کالے لہو سے بھگوئیں گے ہم
تیرے دامن پہ رسوائیوں کے نشاں
آنسوؤں کے سمندر سے دھوئیں گے ہم

آخری مرتبہ اے متاعِ نظر

آج اپنے گناہوں پہ روئیں گے ہم
تیری آنکھوں میں اب اے نگارِ وطن
شرمساری کے آنسو نہیں آئیں گے
ہم کو تیری قسم اے بہارِ وطن
اب اندھیرے سفر کو نہ دہرائیں گے
گر کسی نے ترے ساتھ دھوکہ کیا تو وہ کوئی بھی ہو
اُس کے رستے میں دیوار بن جائیں گے
جان دے کر ترا نام کر جائیں گے

۳۰
۱۲
۷۱

نئی نسل کا نوحہ

میں سوچتا ہوں،
لکھا ہے جو کچھ پڑھا ہے جو کچھ، وہ کس لیے تھا
کہاں سے پوچھوں!
وہ کس لیے ہے کسے بتادوں،
مجھے عقیدوں کے خواب دے کر کہا گیا ان میں روشنی ہے!
چمکتی قدروں کی چھب دکھا کر مجھے بتایا یہ زندگی ہے
سکھائے مجھ کو کمال ایسے
یقیں نہ لائیں سکھانے والے اگر اُنھیں کو میں جا سناؤں
میں کہنہ آنکھوں کی دسترس میں نئے مناظر کہاں سے لاؤں
کہاں پہ جنبشِ کمال رکھوں۔ خیالِ تازہ کہاں سجاؤں
زمین پاؤں تلے نہیں ہے تو کیسے تاروں کی سمت جاؤں

پُرانی قدریں جو محترم ہیں
اُنھیں سنبھالوں یا آنے والے نئے عقیدوں کا بھید پاؤں

وہ سب عقیدے تمام قدریں خیال سارے
جو مجھ کو سکّے بنا کے بخشے گئے تھے میرے حواسِ خمسہ سے معتبر تھے
جب اُن کو رہبر بنا کے نکلا
تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
میں ایسے بازار میں کھڑا ہوں جہاں کرنسی بدل چکی ہے

۳۱
۱
۷۲

سلام تجھ کو طلوعِ فردا

اسی زمیں سے نمود میری اسی زمیں پر حساب میرا،
میں پچھلی نسلوں کا خواب بن کر گزرتے لمحوں میں جاگتا ہوں،
میں آنے والے دنوں کی آہٹ ہوں، اُن زمانوں کو دیکھتا ہوں،
جو سارے سینوں میں خواہشوں کے لباس پہنے اُبھر رہے ہیں
میں آنے والی رُتوں کے دامن میں ایسے پھولوں کو سونگھتا ہوں
ابھی تک جو کھلے نہیں ہیں
میں ایسے الفاظ سُن رہا ہوں جنھیں مطالب ملے نہیں ہیں،
خزاں میں پھوٹی ہیں میری کلیاں، اُگا ہے خوں میں گلاب میرا
اسی زمیں سے نمود میری، اسی زمیں پر حساب میرا

ستم رسیدوں کی بستی بستی ہوا کے رستے میں اپنے موسم کی منتظر ہے
یہ بے کسی کا طویل صحرا سکوں کی منزل سے بے خبر ہے

کنارِ دریا جو مر رہا ہے یہ وہ شہیدوں کا کارواں ہے
حیاتِ انساں شکم کے دوزخ کو بھرتے رہنے کی جستجو میں
بھٹکتے رہنے کی داستاں ہے،
یہاں دُکھوں کے مہیب سائے دروں دریچوں میں اس طرح سے
جمے کھڑے ہیں کہ لاکھ سورج اُبھر کے ڈوبے
گھروں کے آنگن کرن کرن کو ترس رہے ہیں
مکان ایسے کھڑے ہیں جیسے گزرنے والوں پہ ہنس رہے ہیں
یہ وہ خرابے ہیں جن میں صدیوں سے لاکھوں انسان بس رہے ہیں
یہ وہ زمینیں ہیں جن کی قسمت میں خشک سالی لکھی گئی ہے
اگرچہ آنسو اُمنڈ رہے ہیں، اگرچہ بادل برس رہے ہیں
اُداس لمحے کچھ اس طرح سے گزر رہے ہیں
کہ جیسے کوئی جوان بیٹے کو دفن کر کے پلٹ رہا ہو
عجیب گنبد کی سی فضا ہے مری صدا ہے جواب میرا
اسی زمیں سے نمود میری، اسی زمیں پر حساب میرا

ستم رسیدوں کی بستیوں کو مری طرف سے نوید پہنچے
اُبھرنے والا ہے اب وطن کی زمیں سے ہی آفتاب میرا

کہ میری آنکھوں پہ اُن کے فردا کا حال ظاہر ہے
میں نے دیکھا ہے وہ شکم کے عظیم دوزخ کو بھرتے رہنے کی
داستاں کو بدل رہے ہیں
کرن کرن جو ترس رہے تھے اب اُن دریچوں سے دُکھ کے سایوں
کو قتل کرکے ضیا کے لشکر نکل رہے ہیں
میں بادلوں کی نمی ہواؤں کے خشک جھونکوں میں چھو رہا ہوں،
میں جانتا ہوں اب ان زمینوں پہ آنے والے ہیں ایسے موسم
جو خواب جیسے حسیں ہیں لیکن حقیقتوں کے لباس میں ہیں،
مری طرف سے ستم رسیدوں کی بستیوں کو نوید پہنچے
کہ آنے والے دنوں کے دامن میں اُن کی خوشیاں لپٹی ہوئی ہیں
میں اُن کو مژدہ سُنا رہا ہوں
کہ اُن کے قصّے کا ہی تسلسل ہے باب میرا
گلاب بن کر مہکنے والا ہے اب زمانے میں خواب میرا
سلام تجھ کو طلوعِ فردا، ہرا دلِ انقلاب، میرا
اسی زمیں سے نمود میری، اسی زمیں پہ حساب۔ میرا

۲۸
۲
۷۲

ایک اجنبی سفر

یہ ریل گاڑی

جو جانے بوجھے ہوئے سفر پر رواں دواں ہے

اسے پتہ ہے کہ اس کی منزل اسی سفر میں کہیں نہاں ہے

یہ اپنے رستے پہ گامزن ہے

اور اس میں بیٹھے ہوئے مسافر بھی اپنے رستوں پہ جا رہے ہیں،

عجیب قصّہ ہے، ایک گاڑی کے سب مسافر ہیں

پھر بھی اپنی جگہ پہ ہر ایک کارواں ہے

میں اپنی کھڑکی سے لگ کے بیٹھا، گزرتے پیڑوں کو

سبز کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں کو، جوہڑوں کو

بھرے ہوئے اور خشک نالوں کو، بادلوں کو

مویشیوں اور پاس آتے ہوئے سٹیشن کے سرخ سگنل کو دیکھتا ہوں

یہی مناظر ہر ایک کھڑکی سے لگ کے بیٹھے ہوئے مسافر کے واسطے ہیں

اگر وہ دیکھے!

میں چاند جیتے ہوئے زمانے کا آدمی ہوں
مگر میں اُن میں نہیں ہوں جن کے قدم خلاؤں کو چھُو کے آئے
(ہم اپنی دنیا کے آدمی ہیں مگر یہ دنیا "ہماری دنیا" سے مختلف ہے)
عجیب قصّہ ہے

اپنے ہونے کو جانتے ہیں پر اجنبی ہیں
اُسی طرح جیسے گرد بیٹھے ہوئے مسافر، مرے سفر کے شریک بھی ہیں
پر اجنبی ہیں
یہ اجنبیت کا زرد نقطہ جو میری آنکھوں سے گرد بیٹھے ہوؤں
کی آنکھوں میں پھیلتا ہے — وہ دائرہ ہے
جو میرے ڈبّے سے ریل گاڑی کے باقی ڈبّوں
وہاں سے میرے اُداس گھر تک، وہاں سے شہروں، صغیر قوموں،
کبیر ملکوں، فلک کی بے نام وسعتوں تک چلا گیا ہے،
کوئی نہیں جو مجھے بتائے
میں اجنبیت کے دائرے میں کہاں کھڑا ہوں

۱۳
۴
۷۲

مکالمہ

کون ہو اجنبی !

کس لیے ایسی بے ہودہ دستک سے اہلِ محلہ کی راحت بھری نیند کو

منتشر کر رہے ہو

رات کا تیسرا پہر طبّی حوالے سے سونے کا موزوں ترین وقت ہے،

تم کہاں پھر رہے ہو!

کیا کہا — تم مجھے جانتے ہو، مگر اجنبی . . . . .

. . . .

بھائی، جب میں تمھیں جانتا ہی نہیں تو سوا اجنبی کے بھلا کیا کہوں !

. . . .

بہت خوب ، تم بھی وہی نام رکھتے ہو جس کے وسیلے سے اہلِ محلہ

مجھے جانتے ہیں ، مگر اجنبی

میں تمھیں اجنبی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا — !
غالباً تم ابھی تازہ وارد ہو اور شہر کے گیٹ پر درج اعلان بھی تم نے
دیکھا نہیں

بحث کرنے کی مہلت نہیں اجنبی، بھاگ جاؤ ابھی
اور جب تک مری موت کی اطلاع نہ ملے، شہر سے دور رہنا،
اس جگہ کوئی شے دوسری چیز کے متماثل نہیں —

۱۱
۴
۷۲

جدائی کی پانچویں سالگرہ

جی میں ہے آج کی شب اُس کے لیے جاگ کے کاٹی جائے،
وہ جو آنکھوں سے پرے
اجنبی دیس کی گمنام ہواؤں میں کہیں بیٹھی ہے،
کیا محبّت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میں
اُس کے چہرے کو خد و خال میں لا کر دیکھوں،
سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں، اُس کی جبیں کیسی تھی؟
ہونٹ کیسے تھے، بدن کیسا تھا، آنکھیں کیا تھیں!
بس یہی یاد ہے وہ جیسی نظر آتی تھی
اُس سے کہیں اچھی تھی
(یہ مہ و سال کا طوفان بہت ظالم ہے
وہ اگر پاس بھی ہوتی تو کسے علم ہے کیسی ہوتی!)

یوں تو ہر رات مرے دل پہ گراں کٹتی ہے
پھر بھی اے بھولے ہوئے، تو ہی بتا
غم کی زنجیر بھلا
جاگنے، سوچتے رہنے سے کہاں کٹتی ہے!
یہ جو آہٹ سی ابھی نکہتِ گل کی طرح پھیلی ہے
تیرے قدموں کی صدا لگتی ہے
جب کبھی کوئی جہاز یاد کی شمع لیے غم کی بے چین ہواؤں سے گزرتا ہے تو دل
شامِ فرقت کے تصور سے لرز اٹھتا ہے
شامِ فرقت! جو حقیقت ہے مگر خواب نما لگتی ہے
چاند جب ابر کے ٹکڑوں میں سفر کرتا ہے تو یوں لگتا ہے
میں بھی اک ابر کا ٹکڑا ہوں جسے تیرا وصال
ایک لمحے کی رفاقت میں ملا،
اے مرے گزرے ہوئے چاند! مجھے تیرا وصال
تیرا ایک لمحۂ وصال
دائمی، ہجر کے اندوہِ مسلسل کے عوض بار نہیں!
اے مجھے ابر کے ٹکڑے کی طرح چھوڑ کے جانے والے

تیرے بخشے ہُوئے لمحے کے عوض
کیا مجھے دینا پڑا، اس سے سروکار نہیں۔

پانچویں سال گرہ آج جُدائی کی مناؤں شب بھر
شامِ فرقت کی طرح، اشک بہاؤں شب بھر
پھر ائیرپورٹ کی ریلنگ پہ ٹکا کر کہنی
تیری رخصت کا سماں، دھیان میں لاؤں شب بھر
تو جو روتی ہوُئی آنکھوں سے پرے
اجنبی دیس کی گمنام ہواؤں میں کہیں بیٹھی ہے۔

۱۹
۵
۷۲

زمین پیاسی ہے

بلکتے بچّے کی ایڑی سے تا بہ دشتِ فرات
حدیثِ تشنہ لباں سو طرح سے نکلی ہے
ہوس سے چُور زمیں کے خمارِ خواہش میں
ہزار برف قبا چوٹیاں پگھلتی ہیں
میانِ سنگِ گراں، اپنی سرد کاہش میں
سُکڑتی، پھیلتی نہروں کے جال بُنتی ہیں
یہ ناچتے ہوُئے جھرنے یہ بولتے چشمے
سمندروں کا زمیں سے عظیم پھیلاؤ!
یہ بادلوں کی سواری میں بھاگتے قطرے
وہ کائنات کی وسعت ہو یا کہ نقطۂ ذات
ہر ایک رنگ میں پانی کی فصل اُگتی ہے

نگر نگر میں رواں خون ہے تمنّا کا
لہو لہان ہیں بچّوں کی سبز چہکاریں
فضا میں کوندرہی ہیں ہوس کی تلواریں

لہو کی کوکھ سے پھوٹا ہے تخمِ دنیا کا،
وہ ایشیا کی زمیں ہو کہ ارضِ افریقہ
ہمارے خوں سے روشن ہیں ظالموں کے چراغ
لہو کی بزم جمی ہے، چھلک رہے ہیں ایاغ
غمِ حیات کے دریا سے تا بہ دشتِ ممات
لہو ترنگ ہواؤں کی حکمرانی ہے!

جو بہہ چکا ہے لہو رائیگاں نہ جائے گا
تمام دنیا کے مظلوم لوگ کہتے ہیں
تمام دنیا کے محکوم لوگ کہتے ہیں
لہو بغیر کوئی حکمراں نہ جائے گا!
لہو بدست چلو بے کسو، اُٹھو آؤ!
کسی کے واسطے ٹھہرے نہیں کبھی دن رات
یہی عمل کی گھڑی ہے یہی ہے فصلِ نجات
تمام دنیا کے تشنہ لبو، اُٹھو، آؤ
طلوعِ صبحِ ازل سے زمین پیاسی ہے!

۱۶
۶
۷۲

پھر پکاریں اُسے

پھر پکاریں اُسے
آخری مرتبہ پھر پکاریں اُسے
ان سُنی آہٹوں کے تعاقب میں ہم
تا کجا خواب تاروں کو بُنتے رہیں
اُس کے بے نقش پیکر کی تخلیق میں
اپنے رنگوں سے محروم ہوتے رہیں
اُس کے انصاف کی بے نشاں آس پہ
خون دیتے رہیں، ظلم سہتے رہیں
پھر مسافت کا آخر کوئی انت ہے تا کجا طے کریں
بے جہت فاصلے، کارواں کارواں لڑکھڑاتے ہوئے
گِرد بادوں کو منزل بناتے ہوئے
زخم کھاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے
زیرِ لب حمدیہ گیت گاتے ہوئے

آؤ مل کر ذرا آج ڈھونڈیں اُسے
وہ جو کہتا ہے میں ہر جگہ ہوں، چلو آج دیکھیں اُسے

اس قدر زور سے اُس کو آوازیں دیں
آسماں اور زمیں ٹین کی چادروں کی طرح بج اُٹھیں،
اُس کو اخبار کے ہر ورق پہ جلی سرخیوں سے لکھیں
"تم جہاں پر بھی ہو لوٹ آؤ، اگر تم نہ آئے
تو سجدوں کی بیمار بوڑھی روایت بکھر جائے گی۔"
ریڈیو اور ٹی وی پہ اُس سے کہیں
"تم اگر ہو تو آؤ، تمھارے لیے ہم گھروں میں دیے
اور دلوں میں عقیدت کی شمعیں جلائے ہوئے منتظر ہیں
تمھارے بنا روشنی اپنے سائے سے ڈر جائے گی۔"
سب عبادت گھروں کے بلند اور چوبی منقّش دروں پر یہ نوٹس لکھیں
"تم اگر اپنے ان شیشہ خانوں سے باہر نہیں آؤ گے
تو سُنو۔

ہم بھی اندھے سفر پہ نہیں جائیں گے،
زخم کھائیں گے تو خود بھی خنجر کی صورت نکل آئیں گے
حمد یہ گیت لب پر نہیں لائیں گے
آخری مرتبہ پھر پکاریں اُسے

۴/۸/۷۲

اگر کوئی کہے

اگر کوئی کہے "میں نے ہوا کو مٹھیوں میں بند دیکھا ہے
زمیں ساکن ہے، دنیا اک مثلث کی طرح ہے
روشنی آنکھوں کا دھوکا ہے"
تو مت کہنا وہ جھوٹا ہے
اگر کوئی کہے یہ ابر کا ٹکڑا حقیقت میں تمنّا کا ہیولیٰ ہے
یا اک بھٹکا مسافر ہے
سمندر کی یہ پہنائی، تلاطم کی توانائی
فقط دو بوند پانی کی کہانی ہے، جو ہم تشنہ لبوں کی آنکھ کا
بے صرفہ جوہر ہے،
یہ سورج اصل میں ناکام اُمیدوں کا ملبہ ہے
ستارے ان کہی باتوں کے سائے ہیں، چمکتا چاند
ٹوٹی آرزوؤں کا جھروکا ہے

یہ پھولوں سے مہکتی شاخ قاتل کا ارادہ ہے
تو مت کہنا وہ جھوٹا ہے؛

اُسے تم کس طرح جھوٹا کہو گے، عین ممکن ہے
وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس پہ ہی ایمان رکھتا ہو۔
تمھیں معلوم ہے ایمان وہ واحد حقیقت ہے
کہ جس کے ضمن میں پانچوں حسیں بیکار ہوتی ہیں
تخیّل کی اُڑانیں نقطۂ پرکار ہوتی ہیں

اسے دیکھو یہ میرا شہر ہے میرا ٹھکانہ ہے
یہاں وہ لوگ بستے ہیں جنھیں اپنی زمیں سے دوسروں کی باس آتی ہے
یہاں آزاد بندوں کو غلامی راس آتی ہے
یہاں بھوکے کبھی نعرے کبھی گولی سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں
یہاں ڈاکو سرِ بازار آزادانہ پھرتے ہیں، محافظ منہ پہ
ڈاٹھے باندھ کر گھر سے نکلتے ہیں
یہاں رشتوں کے بندھن سوت کے دھاگوں سے کچّے ہیں،

کہ لوگوں نے تعلق کے چمکتے دودھ میں گندا لہو گھولا
خود اپنے جسم کے ٹکڑوں پہ بابِ دشمنی کھولا
جو حق کے واسطے بولا اُسے قدموں تلے رولا،
یہ جو چاروں طرف اک سحر کا سا کارخانہ ہے
اسے دیکھو یہ میرا شہر ہے میرا ٹھکانہ ہے
یہ وہ بستی ہے جس میں ظلم کو انصاف کا نعم البدل
اور راہزن کو راہبر تسلیم کرتے ہیں
وہ گلشن ہے جہاں چیخوں کا مطلب خوش نوائی ہے
پرندے ہر نئے صیّاد کی تکریم کرتے ہیں۔
ہنرمندوں کا ثانی ڈھونڈنا ازبسکہ مشکل ہے
مگر اس شہر کی مشکل زمانے سے انوکھی ہے
یہاں تو بے ہنر لوگوں کا بھی ثانی نہیں ملتا۔

مجھے بھی دیکھنے میں یہ تماشا جھوٹ لگتا ہے
مگر یہ بے یقیں منظر
مرے ماحول اور تاریخ کا سب سے بڑا سچ ہے

یہ وہ سچ ہے کہ جس کا زہر میرے جسم میں دن رات پلتا ہے
ہواؤں کی طرح دشتِ بدن میں رقص کرتا ہے ۔

مجھے دیکھو میں ایسے شہر میں زندہ ہوں
جس میں زہر نے تریاق کا عہدہ سنبھالا ہے
میں اُس کو کس طرح جھُوٹا کہوں
جس نے ہوا کو مٹھیوں میں بند دیکھا ہے

۲۱
۹
۸۲

رات کس وقت ڈھلی

رات کس وقت ڈھلی

کس کو معلوم ہوئی صبحِ تمنّا کس وقت

رات کس وقت ڈھلی

کوئی اُس وقت نہ تھا میرے قریب

جب سرِ کوئے حبیب

شوق کی بات چلی

کیا خبر کیسے ہوئی دل کی کہانی آخر

رات کس وقت ڈھلی

کیا خبر کون اُفق سے اُبھری

آنکھ کے طاق میں اُمید کی بے نام کرن

یوں چلی قافلۂ حرف و صدا کی خوشبو

جیسے مہکا ہو چمن

دل میں اس طرح کسی یاد نے کروٹ بدلی

جیسے ڈر جائے ہرن

سانس میں یوں کسی جذبے نے اُٹھائیں پلکیں
جیسے کھِلتی ہے کلی،
رات کِس وقت ڈھلی۔

رات کس وقت ڈھلی، کس کو خبر، ڈوب گیا
کس گھڑی بھیگتی آنکھوں میں ستارا غم کا
(کس نے پایا ہے کنارا غم کا)
اس قدر اوس پڑی کانپتے رخساروں پر
اپنے چہرے پہ گلستاں کا گماں ہونے لگا
دشتِ دل سیلِ رواں ہونے لگا۔
جب کبھی آنکھ اُٹھی تاروں پر
چاندنی مانند ہُوئی خواب بنے انگارے
شوق نے درد کی دیواروں پر
نام کیا کیا نہ لکھے اور مٹائے پیارے،
آئنہ خانۂ خواہش پہ ہر اک لمحۂ ہجر

صورتِ سنگ لگا
آ مرے دوست مجھے انگ لگا
میں مسِ خام ہوں کر دے مجھے سونے کی ڈلی
رات کس وقت ڈھلی

کتنے موسم تھے جنھیں تیرا پتہ مل نہ سکا
کتنی شامیں تھیں جنھیں رنگِ حنا مل نہ سکا
کتنے سجدے تھے جبینوں کی کمیں گاہوں میں
جن کو اے دوست ترا قبلۂ پا مل نہ سکا
میں بھی اک سجدۂ گم راہ کی صورت تیرے
نقشِ پا ڈھونڈ کے مایوس پلٹ آیا ہوں
میں وہ مشعل ہوں کہ جو کوچۂ کوراں میں جلی
وہ مسافر ہوں جسے مل نہ سکی تیری گلی
کیا خبر مجھ کو ہوئی صبحِ تمنّا کس وقت
رات کس وقت ڈھلی

۱۴
۱۰
۷۲

گمشدہ عکس

کون ہیں یہ جو مٹھیاں اپنی
کھوٹے سکّوں سے بھر کے لائے ہیں
آنکھ کے بے ذخار دامن میں
کون ہیں یہ جو لے کے آئے ہیں
بے ثمر خواب، بے ہنر آنسو
بے جہت پاؤں، مضمحل بازو
اک ارب لوگ ہیں کہ سائے ہیں

اتنے پتھّر اگر بہم ہو جائیں
رفعتِ کوہ آسمان لگے
اتنے ذرّے اگر ہوں جمع کہیں
وسعتِ دشت بے نشان لگے

اتنے تارے اگر چمکتے ہوں
ظرفِ خورشید اک چراغ لگے
اتنے غنچے اگر مہکتے ہوں
موسمِ زرد بے سراغ لگے

کون ہیں یہ جو رات دن اپنی
گمشدہ بستیوں کے ملبے سے
بے عمل خواہشیں اُٹھاتے ہیں
کون ہیں یہ جو چیونٹیوں کی طرح
ٹوٹی قبروں میں گھر بناتے ہیں
کون ہیں یہ جو میرے چار طرف
چلتے پھرتے ہیں آتے جاتے ہیں

میں نے دیکھا تو جتنے چہرے تھے
ہو بہُو نین نقش میرے تھے

۸/۲/۷۳

سُورج کی پہلی کرن

سُن اے ہوائے بے دلی
ابھی تو چشمِ تر میں اُن کی صورتیں رواں دواں ہیں
جن کے سانس کی مہک میں جا چکی بہار کا نکھار ہے۔
کہ جن کے خواب کی چمک، پلک پلک بکھرتی آرزو میں پائدار ہے۔
ابھی تو ان کی خاک کو زمیں بھی نہیں ملی
سُن اے ہوائے بے دلی
اگرچہ اس دیار میں ہر ایک سُو گئی رُتوں کی گمشدہ
بہار کا فشار ہے، غبارِ انتظار ہے
مگر یہ زرد گھاٹیاں یہ کاروانِ بے نشاں
سفر کی انتہا نہیں
دھواں دھواں ہیں جسم و جاں، مگر زباں ہے گلفشاں
کہ دل ابھی مرا نہیں

نظر میں ہے وہ فصلِ گل جواب تلک نہیں کھلی
سُن اے ہوائے بے دلی۔

سُن اے ہوائے بے دلی
ہمیں اسی زمین سے، رفاقتِ یقین سے
ملے گی کشتِ آرزو کہ روشنی کی جستجو میں روشنی کا راز ہے
ہمارے اِرد گرد کی ہر ایک شے سوال ہے
ان انگلیوں کی پور پور صاحبِ کمال ہے
الوداع — الوداع اے بے دلی
کہ یہ ہماری دوستی کا نقطۂ زوال ہے۔

۱۷
۲
۷۳

جنگی قیدیوں کے لیے ایک نظم

یہ کیسی رُت ہے
کہ آنگنوں میں تو پھُول کھلتے ہیں اور آنکھوں میں
پچھلے موسم کے خشک پتّے بکھر رہے ہیں
گلاب چاروں طرف کِھلے ہیں
مگر دریچوں میں جانے والوں کی راہ تکتے اُداس چہرے
خزاں کی دہلیز پر کھڑے ہیں

ہوا کے جھونکے سے کھڑکیوں کے سیاہ پردے جو سرسرائیں
تو ایسے لگتا ہے جیسے ہاتھوں نے چوڑیوں کے بجائے بچھو پہن لیے ہوں
خموش بچّے تہی نگاہوں سے اپنے ٹوٹے ہُوئے کھلونوں
کو دیکھتے ہیں تو لانے والوں کے خواب سائے
سکون نیندوں میں جاگتے ہیں

اُلجھتے بالوں میں پچھلی رُت کے لگائے پھُولوں کی سبز خوشبو
شفیق ہاتھوں کو ڈھونڈتی ہے
بچھڑنے والوں کی یاد کانوں میں لڑکھڑاتی ہُوئی صداؤں کے جال بُنتی ہے
آس چُنتی ہے

دل کے اُجڑے ہُوئے چمن سے خیال ریزے
اُبھرتے سُورج کی سرخ کرنوں کے تیز نیزے
جو کھڑکیوں کے دبیز شیشوں کو کاٹتے ہیں
تو جانے والوں کے خالی بستر ہر ایک منظر پہ پھیلتے ہیں۔
ضعیف ہونٹوں میں آرزو کے سفیر چلتے ہیں
اور ہاتھوں کی جُھرّیوں سے گئے زمانے پکارتے ہیں
اُجاڑ کمروں کی سنسناہٹ میں سانپ وہموں کے رینگتے ہیں۔

یہ کیسی رُت ہے
بہار آکر کھُلے کواڑوں کو کھٹکھٹاتی ہے
بے دلی کی ہوا دریچوں میں سرسراتی ہے
اور پیلے گلاب آنگن میں کھِل رہے ہیں

یہ کیسی رُت ہے
کہ پانیوں میں تمام منظر گھرے ہوئے ہیں
مگر نگاہوں میں پیاس لکھی ہے
کیسا نشّہ ہے جو سمندر سما گیا ہے
خمارِ غم کا لہو کے صحرا میں دوڑتا ہے۔

وطن کی مٹی سے دُور بیٹھو
جو گھر ستائے تو یاد رکھنا
مفارقت کے طویل رستے میں تم اکیلے نہیں ہو
ہم بھی تمھاری آہٹ کے ہم سفر ہیں
تمام آنکھیں تمھارے قدموں کی منتظر ہیں۔
تمام سینے تمھارے گھر ہیں۔

۲۳
۴
۷۳

ایک شہر کی کہانی

شجر چپ چاپ
سڑکیں دُور تک
آنکھوں کی ساکت پُتلیوں کی مثل خالی ہیں
گھروں کے بام و در مبہم دھندلکوں میں گھرے ایسے کھڑے ہیں
جس طرح گہری خموشی جنگلوں کی شام میں اُترے
تو پتے تک نہیں ہلتے
دریچہ بند کمروں میں کسی بے نام دہشت کے ہیولے
آہٹیں بن کر بھٹکتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے
شہر اک صدیوں پُرانا مقبرہ ہے، جس میں
کب کے مر چکے لوگوں کے ٹوٹے استخواں
چمگادڑوں اور خون کی پیاسی چڑیلوں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔

(۲)

سحر ہوتے ہی اس وحشت کدے کا رنگ بدلے گا
نئے اخبار، روشن سرخیاں لے کر پُرانے ہوٹلوں کی
بے ثمر میزوں، دکانوں، دفتروں اور آنگنوں میں
صفحہ صفحہ ہو کے بکھریں گے،
درختوں کا تحیّر ریزہ ریزہ ہو کے ٹوٹے گا،
بسیں، کاریں، سکوٹر، آدمی
سیلاب کے پانی کی صورت شہر کی سڑکوں پہ نکلیں گے،
(بس اتنا فرق ہے سیلاب کا پانی
کناروں سے نکلتا ہے تو پھر واپس نہیں آتا)
جہاں تک روشنی سورج کی جائے گی،
مشینوں کی طرح سب لوگ اس کے ساتھ جائیں گے
کہ یہ بستی حقیقت میں بڑا سا کارخانہ ہے
جہاں ہر شخص اک خود کار کل کی مثل چلتا ہے۔
گزرتی شفٹ کے آخر سے اگلی شفٹ کے آغاز تک
اک وقفۂ موہوم ہے جس میں مشینیں

تیل لیتی ہیں پھر اپنی ہی طرح کی دوسری
چھوٹی کلوں کی ساخت میں مشغول ہوتی ہیں،
کہ اس پیہم تسلسل کا اسی میں آب و دانہ ہے
مشینیں آدمی ہیں اور دنیا کارخانہ ہے

(۳)

سحر اور رات کی اس بے عمل مصروفیت میں شہر کی تاریخ بنتی ہے۔
سینما گھر، کلب، ہوٹل، ادب، اخلاق، شہرت اور سیاست کے
منافع بخش کاروبار چلتے ہیں
کوئی دیکھے تو سارا شہر جیسے فلم کی شوٹنگ میں کھویا ہے
ہدایت کار سے سیٹ پر کھڑے "شوقین چہروں کی طرح
ہر شخص ادا کے کی صدا کے سحر میں محصور ہے
جیسے پیک اپ کی گھڑی ہی منزلِ مقصود ہو۔
جیسے سب کچھ اس کہانی کے سوا بے سود ہو۔

(۴)

خزاں پتوں سے بوجھل ٹوٹتی شاخوں کے پہلو سے
نئی کلیاں نکلتی ہیں مناظر اپنے پیراہن بدلتے ہیں

سجیلے نوجواں بینر لیے سڑکوں پہ آتے ہیں
"ہمیں اس علم کی حاجت نہیں جو آدمی کو کارخانے کے لیے
اِک فالتو پُرزہ بناتا ہے، ہمیں سچائی کے بھُولے ہُوئے قفلوں کی
کُنجی دو کہ ہم اس بے جہت صحرا میں اپنی رہگزر پائیں"
گولیاں چلتی ہیں، بینر نوجواں ہاتھوں کی مٹّھی سے پھسلتے ہیں
بہت سے گھر ہمیشہ کے لیے اک جا چکی خوشبو کو روتے ہیں
مگر بینر نہیں گرتے ـــ مگر بینر نہیں گرتے
اگر اک ہاتھ کٹتا ہے تو لاکھوں ہاتھ اُس کے خون سے
تخلیق ہوتے ہیں

مشینوں سے بھری بستی میں یہ واحد صدا ہے
جس کے ہونے سے یہاں انسان کی موجودگی کی آس زندہ ہے
اس اندھیرے ـــ اس سمندر سے بڑے کالے اندھیرے میں
یہ اک روشن دیا ـــ واحد دیا تابندہ ہے۔

۴
۷
۷۳

آخری شام

یہ مہ و سال جو ہم
روتے ہُوئے ہنستے ہُوئے کاٹتے ہیں
حاصلِ عمرِ رواں جانتے ہیں
چشمِ خورشید کی تقویم میں اک لمحۂ پرّاں کی طرح ہیں
کہ جیسے اک نظر دیکھو تو پھر آنکھ سے اوجھل ہو جائے۔

وہ تو پھر شام تھی
ان لاکھوں مہ و سال کے گرداب میں تنکے کی طرح بہتی ہُوئی شام جسے
روکتے روکتے دن رات میں ڈھل جاتا ہے
جیسے سیماب کہ مٹھی سے پھسل جاتا ہے
وہ عجب شام تھی لیکن جس کے
رینگتے سایوں کے پہلو میں زمانے گم تھے

خون میں ڈوبی ہُوئی ریت پہ ہے گوروکفن
اُن شہیدوں کے بدن تھے کہ جنھیں
آسماں سینکڑوں صدیوں میں جنم دیتا ہے
اُن کے جلتے ہُوئے خیمے تھے جنھیں
اپنے دامن کی پنہ، بابِ حرم دیتا ہے
وقت کا کام گزرنا ہے گزر جاتا ہے
کیا منہ زور بھی طوفاں اُتر جاتا ہے
وہ عجب شام تھی لیکن جس کا
ایک اک لمحہ زمانوں پہ جہانگیر ہُوا،
لوحِ تاریخ پہ جس کا ہر لفظ'۔ بولتے خون سے تحریر ہُوا
اہلِ ایمان کی تقدیر ہُوا

آج تک گزری نہیں
چشمِ خورشید کی تقویم میں اس رنگ کی شام
خون سے لکھتا تھا اک شخص وفا کا پیغام
ابنِ آدم کی ہر اک نسل کے نام
اے حسینؑ ابنِ علی تجھ پہ سلام
اے حسینؑ ابنِ علی تجھ پہ سلام

۳۱
۱
۷۴

گِلہ

گِلہ ہوا سے نہیں ہے ہوا تو اندھی تھی
مگر وہ برگ کہ ٹوٹے تو پھر ہرے نہ ہوئے
مگر وہ سر کہ جھکے اور پھر کھڑے نہ ہوئے
مگر وہ خواب کہ بکھرے تو بے نشاں ٹھہرے
مگر وہ ہاتھ کہ بچھڑے تو استخواں ٹھہرے

گِلہ ہوا سے نہیں تندیٔ ہوا سے نہیں
ہنسی کے تیر چلاتی ہوئی فضا سے نہیں
عدو کے سنگ سے اغیار کی جفا سے نہیں
گِلہ تو گرتے مکانوں کے بام و در سے ہے
گِلہ تو اپنے بکھرتے ہوئے سفر سے ہے

ہوا کا کام تو چلنا ہے اس کو چلنا تھا
کوئی درخت گرے یا رہے، اُسے کیا ہے
گِلہ تو اہلِ چمن کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دھول میں لپٹے ہوئے شجر سے ہے
گِلہ سحر سے نہیں رونقِ سحر سے ہے

۱۸
۲
۷۱

آخری بوسہ

مرے ہونٹوں پہ اُس کے آخری بوسے کی لذت ثبت ہے
وہ اُس کا آخری بوسہ
جو مستقبل کے ہر اک خوف سے آزاد
اک روشن ستارا تھا
گزرتی رات کے ننگے بدن پر تل کی صورت قائم و دائم
ہمیشہ جاگنے والا ستارا
میں جیسے اِس آگ برساتے ہوئے سورج کے آگے
جگمگاتا دیکھ سکتا ہوں۔

وہ اُس کا آخری بوسہ
جو اس نفرت بھری دنیا میں
اک خوشبو کا جھونکا تھا

بکھرتی پتّیوں میں موسمِ گُل کے اشارے کی طرح
اک ڈولتی خوشبو کا جھونکا
میں جیسے اس حبس کے کالے قفس کی تیلیوں سے
مسکراتا دیکھ سکتا ہوں۔

وہ اُس کا آخری بوسہ
جو اِن مرتی ہُوئی صدیوں میں
اک بے انت لمحہ تھا
تلاطم میں کسی ساحل کی پہلی دید سا
انمول اور بے انت لمحہ
میں جیسے اشکوں کی اس دیوار میں
رخنے بناتا دیکھ سکتا ہوں
مرے ہونٹوں پہ اُس کے آخری بوسے کی لذّت ثبت ہے
وہ اُس کا آخری بوسہ جو میں اپنے بدن میں
سانس صورت آتا جاتا دیکھ سکتا ہوں
لہو کی خامشی میں سرسراتا دیکھ سکتا ہوں

۱۹/۲/۷۴

گواہی

اس سے پہلے کہ یہ ساون کی جھڑی ختم جائے
جتنے اقرار کے الفاظ ہیں کہہ دو مجھ سے
بھیگتے پیڑ ہیں میں ہوں، تم ہو
اِس برستے ہوئے بادل کی طرح
لفظ اگر مُڑ کے نہ آئے بھی تو کیا!

بھیگتے پیڑ کسے جا کے گواہی دیں گے

۴
۸
۷۴

○

شاعری کی وادی سے گزرتے ہوئے قاری کے
بھی پر لگ جاتے ہیں ۔ نئی آہٹیں اور نئی آوازیں اس
طرح سُنائی دیتی ہیں جیسے بادل بروقت برسیں ۔ امجد اسلام
کی شاعری بھی اپنے قاری کو اسی طرح متوجہ کرتی ہے ۔
زندگی کی سرحدیں نہیں ہوتیں اور ہمیشہ آگے بڑھتی ہوئی
یہی زندگی ان کی شاعری کا سرچشمہ ہے ۔ یہاں محبت
کرب بھی ہے اور مسرت بھی ۔ مسرت سرشاری کا وسیلہ
بنی ہے اور کرب آگہی کا ۔ اور اگر ہم سُن سکیں تو ہمیں
امجد اسلام کی شاعری میں جوانی اور شادمانی کے نغمے
بھی سُنائی دیں گے اور قاتل قدموں کے نیچے آنے والی
سرزمین وطن کی دلدوز کراہ بھی سُنائی دے گی ۔ یہی دلدوز
کراہ بوئے مقتل بن کر شہرِ وفا شعاراں میں امجد اسلام
کو عوام دوستی کا نقیب بنا دیتی ہے ۔

صلاح الدین محمد

امجد اسلام امجد

۴ اگست ۱۹۴۴

ایم.اے ـ تدریس